جلد 8 شمارہ 1 مارچ 2006ء صفر 1427ھ

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ○ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ○ (الاعلیٰ 14-15)

بے شک وہ مراد کو پہنچ گیا جو پاک ہوا۔ اور اپنے رب کے نام کا ذکر کرتا رہا اور نماز پڑھتا رہا۔

وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا

اللہ

محبت

صداقت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پرواز مسلسل

عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح وفلاح کا علمبردار

ماہنامہ

فلاحِ آدمیت

گوجرانوالہ

Registerd

CPL No. 491

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

ماہنامہ
آدمیت
فلاح
گوجرانوالہ
عالمگیر محبت اور بنی نوع انسان کی اصلاح و فلاح کا علمبردار

بیادگار
خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ
بانی سلسلہ

نگران و سرپرست
محمد صدیق ڈار توحیدی صاحب
شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ

جلد 8 شمارہ 1 مارچ 2006ء صفر 1427ھ

ایڈیٹر وحید احمد

قیمت ———— -/20 روپے　　سالانہ فنڈ ———— -/200 روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:
محمد صدیق ڈار توحیدی
مرکز تعمیر ملت نزد توحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ
Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:
وحید احمد
تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ
Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

درسِ قرآن

آلِ عمران

(ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ)

اِس سورۃ میں سیدہ مریم علیہ السلام کے آباؤ اجداد کا ذکر ہے جو آلِ عمران کے لقب سے مُلقب تھے۔

زمانہء نزول

یہ سورۃ مدنی ہے، جنگ احد کے بعد کے دور میں نازل ہوئی۔

شانِ نزول اور مضامین

اس سورۃ کے مضامین میں بھی تنوع ہے۔ آغاز میں روئے سخن نصاریٰ کی جانب ہے۔ ہجرت بلکہ جنگ بدر کے بعد پیش آمدہ حالات اور یہودیوں کی سازشوں کے باعث مسلمان بطور آخری اُمت خطہء عرب کے علاوہ بھی متعارف ہونے لگے۔ تو نجران کے عیسائی حکمران کو تشویش ہوئی۔ اس نے عیسائی مبلغین اور مناظرے کے ماہرین کی ایک جماعت نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مناظرہ کرنے کیلئے مدینہ کی جانب روانہ کردی۔ اس لئے آغاز سورۃ میں راسخ العقیدہ مسلمانوں کی علامات اور اوصاف کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر نصاریٰ کے مذہب میں پیدا ہونے والی اعتقادی اور عملی کمزوریوں کو ذکر کرنے کے بعد ان کی اصلاح کیلئے اقدامات کا بیان ہے۔ لیکن جب اُنہوں نے اس دعوت کو بھی تسلیم نہ کیا تو مباہلہ کیلئے اُن کو دعوت دی گئی۔

نبی کریم ﷺ نے مدینہ میں تشریف آوری کے بعد یہود کی سازشی طبیعت کو پہچان کر اُن سے جنگی اور معاشرتی معاہدات کئے مگر یہود ان معاہدات کی خلاف ورزی کرتے رہے جس سے مسلمانوں کو اُن کی طرف سے خدشہ رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے یہود کی اس سرشت و جبلت کا ذکر کیا ہے کیونکہ جنگ بدر کے دوران میں بھی اِن یہود کی ہمدردیاں عقیدۂ توحید و آخرت کے علمبردار کہلانے کے باوجود مشرکین مکہ کے ساتھ تھیں۔ اُن کی شرارتوں کے باعث نبی کریم ﷺ نے اِن شریر یہودی قبائل کو مدینہ منورہ اور اُس کے نواحی علاقوں سے بھی نکال دیا۔ اب یہود کی آتشِ

انتقام بھڑک اُٹھی۔ یہی وہ دور ہے جس میں مسلمان اپنے آپ کو غیر محفوظ تصور کرتے تھے۔ اس لئے ہتھیار بند رہنا اور راتوں کو پہرہ دینا مسلمانوں کا معمول بن گیا تھا۔ خصوصاً اگر نبی کریم ﷺ چند ثانیے مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہو جاتے یا مدینہ منورہ کے نواحی علاقوں میں تشریف لے جاتے تو صحابہ کرامؓ آپ ﷺ کی تلاش میں نکل پڑتے اور اُس وقت تک چین سے نہ بیٹھتے جب تک آپ کی زیارت سے مشرف نہ ہو جاتے۔ اسی دور میں یہودیوں نے ایک نئی سازش تیار کی جس کے نتیجے میں یہودیوں کی ایک جماعت صبح کے وقت مسجد نبوی میں آکر ایمان کی قبولیت کا اعلان کرتی دن بھر گزرنے کے بعد یہ کہتے ہوئے مجلس سے نکل جاتے کہ یہ وہ نبی نہیں جس کا ذکر توراۃ اور صحیفوں میں ہے۔

جنگِ اُحد اس سورۃ کے نازل ہونے سے قبل ہو چکی تھی اور یہ جنگ دراصل مکہ کے شکست خوردہ عناصر اور یہود کی آتشِ انتقام میں جھلسے ہوئے لوگوں کی ملی بھگت کا نتیجہ تھی۔ اس جنگ کے لئے ایک ہزار مجاہد نبی اکرم ﷺ کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے مگر تین صد منافق راستے ہی سے واپس آگئے۔ اب باقی سات سو مجاہدین رہ گئے۔ ان میں بھی کچھ ایجنٹ فتنہ پھیلانے کیلئے موجود رہے تا کہ آستین کے سانپ بن کر دشمن کی امداد کر سکیں۔

جنگِ اُحد کے بعد جب اس سورۃ کا نزول ہوا تو اس میں اُن تمام خامیوں اور کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی جو دورانِ جنگ میں مسلمانوں سے سرزد ہوئی تھیں اور اس کے ساتھ ساتھ اُن کے لئے عام معافی کا اعلان اور اُن خامیوں کے ازالے کیلئے ہدایت کا بھی ذکر ہے۔ یہ جنگ وہ پہلا معرکہ ہے جو مسلمانوں نے اس قدر بڑی تعداد میں مدینہ منورہ سے باہر نکل کر لڑی جبکہ مسلمانوں کی جنگی تربیت کا پہلو ابھی زیرِ تکمیل تھا۔

اس سورۃ میں نبی کریم ﷺ کی اُمت کو بہترین اُمت قرار دیا گیا اور اس کی عظمت کی بقا کا اصول بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ولا تهنوا ولا تحزنوا و انتم الا علون ان كنتم مومنين۔

''اور تم ہمت نہ ہارنا اور غم نہ کرنا، اگر تم مکمل مومن رہے تو تم ہی غالب رہو گے۔''

(آل عمران:139)

سورۃ کا اختتام بھی باری تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کے اظہار اور دُعا و مناجات پر مشتمل ہے۔

تفسیر

تعارف و ربط ما قبل

سورۂ آلِ عمران قرآن پاک کی تیسری سورۃ ہے۔ سورہ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران میں بہت گہری نسبت ہے نبی اکرم ﷺ نے ان دونوں کو شمس و قمر سے تشبیہ دی اور فرمایا کہ یہ دونوں حشر کے دن دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوگی۔

سورۂ آلِ عمران اُس زمانے میں نازل ہوئی جب اسلام کا غلبہ شروع ہو چکا تھا اور ایسے حالات میں اہل کتاب کے لئے اسلام اور رسول اللہ ﷺ کی اعلانیہ مخالفت کرنا ممکن نہ رہا تھا لیکن در پردہ وہ اب بھی مسلمانوں کے شدید مخالف تھے۔ اِس سورۃ میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت پر زور دیا گیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ مسلمانوں کو اہل کتاب کی ان سازشوں اور گمراہ کن باتوں سے خبردار کیا گیا ہے جو وہ مسلمانوں کو دین اسلام سے ہٹانے کے لئے کرنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی سازشوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے مسلمانوں کو متحد اور مطیع رہنے کا بھی حکم دیا ہے

محکمات اور متشابہات

سورۂ آلِ عمران کے آغاز میں محکمات و متشابہات کے متعلق گفتگو کی گئی ہے۔ قرآن پاک کی چند آیات ایسی ہیں جو محکمات شمار ہوتی ہیں اور چند ایسی ہیں جو متشابہات کے زمرے میں آتی ہیں اول الذکر آیات ایسی ہیں جن میں صاف اور سیدھا حکم دیا گیا ہے۔ کسی کام سے رُک جانے کا حکم ہے جبکہ ثانی الذکر وہ آیات ہیں جن میں اگر جستجو کریں تو عقل عاجز آ جائے گی مثلاً یہ کہا کہ:۔

الرحمٰن علی العرش استوی۔

''رحمٰن اپنے تخت پر براجمان ہوا۔'' (طٰہٰ:5)

یہاں تک بات بالکل واضح ہے لیکن اگر کوئی شخص یہ پوچھتا ہے کہ نعوذ باللہ رحمٰن کی صورت کیا ہوگی؟ اللہ تعالیٰ کا تخت کتنا بڑا ہے اور کس دھات کا بنا ہوا ہے؟ اور کہاں ہے؟ اس سوال کا سیدھا سادہ جواب یہ ہے کہ یہ باتیں اگر جاننا ضروری ہوتیں تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو خود بیان کر

دیا ہوتا یا اُن کی وضاحت کردی ہوتی۔ اگر کوئی بات اللہ اور اس کے رسول مقبول ﷺ نے بیان کرنے سے احتراز کیا ہے تو یہ اس لئے نہیں کہ وہ خدانخواستہ بھول گئے بلکہ وہ بات اس لئے نظر انداز کردی گئی کیونکہ وہ اسی قابل تھی کہ چھوڑ دی جاتی۔ جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک چیز بیان ہی نہیں فرمائی تو پھر ہم اور آپ اس کے پیچھے کیوں پڑیں؟ اللہ کے رسول ﷺ نے ایک چیز کو بیان کرنے کے دوران میں کچھ حصے کو واضح کیا اور کچھ کو غیر واضح چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ ہماری خیر اسی میں پنہاں ہے کہ اس حصے کو غیر واضح ہی رہنے دیں کیونکہ متشابہات کی جستجو کا عمل ہی دراصل فرقہ واریت کی بنیاد بنتا ہے۔

ایک دفعہ سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں بہت دور سے ایک مسافر حاضر ہوا۔ اس نے وہ آیات اکٹھی کر رکھی تھیں جو متشابہات کا درجہ رکھتی ہیں۔ اُس نے ان آیات کے بارے میں سوالات کی فہرست بھی ترتیب دے رکھی تھی، سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر اِس مسافر نے وہ آیات پڑھیں اور اِن متشابہات کے بارے میں اُس نے تمام سوالات پیش کردیئے۔ اِس پر حضرت عمرؓ نے یہ دیکھتے ہوئے کہ یہ شخص تو ان امور کی طرف جھکا ہوا ہے جن میں دخیل ہونا اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے مناسب خیال نہیں کیا، ایک چھڑی سے اس شخص کی خوب پٹائی کی اور فرمایا کہ ''اب بات سمجھ میں آئی؟'' وہ شخص کہنے لگا ''جی ہاں''۔

حضور اکرم محمد مصطفیٰ ﷺ نے اللہ تعالیٰ سے اپنی دعا میں علم نافع یعنی نفع دینے والا علم مانگا ہے۔ وہ علم جس کا ہماری عملی زندگی سے رابطہ اور تعلق ہو اور جس کو ہم لاگو کرسکیں۔ ایسا علم نافع علم ہے جبکہ غیر نافع علم وہ علم ہوتا ہے جو نفع کم اور نقصان زیادہ دے جیسے کہ متشابہات کا علم ہے۔

علم ذہنی عیاشی کے لئے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم ادب برائے ادب اور علم برائے علم کے دشمن ہیں کیونکہ اگر ہم علم برائے علم کے حامی ہو جائیں تو ہمیں علم نافع کے ساتھ علم غیر نافع بھی جاننا ہو گا۔ نجوم، پامسٹری، جفر اور رمل ایسے علوم ہیں جن میں تھوڑا بہت اٹکل پچو قسم کا سچ ضرور موجود ہے لیکن یہ سارے علوم غیر نافع ہیں۔ حضورِ اکرم ﷺ نے اِن کی تحصیل سے منع فرمایا ہے کیونکہ اِن کے حصول میں نقصان کا پہلو زیادہ ہے۔ بعینہٖ قرآن پاک کے متشابہات ہیں۔ ہمارے تمام

اختلافی جھگڑوں کی بنیاد ہی یہ متشابہات بنتے ہیں۔ اِسی لئے اِن کے چکروں میں پڑنے سے روکا گیا ہے۔ کیونکہ زندگی اتنی مختصر اور فرصت عمل اتنی کم ہے کہ محکمات ہی کے لئے وقت نہیں ملتا جبکہ وقت کا دھارا تیزی سے بہتا چلا جارہا ہے، لیکن ہم ہیں کہ مناظرہ بازی اور متشابہات کے چکروں میں اُلجھے ہوئے ہیں اور اسی کی بنیاد پر فرقہ بندی اور گروہ سازی کے جھگڑے اٹھاتے ہیں۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابه منه ابتغاء الفتنة وابتغاء تاویله ج وما یعلم تاویله الا الله۔ والراسخون فی العلم یقولون امنا به کل من عند ربنا وما یذکر الا اولوا الالباب۔

''جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے، وہ متشابہات کا اتباع کرتے ہیں تاکہ فتنہ برپا کردیں اور اصل مراد کا پتا لگائیں۔ حالانکہ اصل مراد اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ علم میں کامل دسترس رکھتے ہیں، وہ یہ کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے۔ یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے اور نصیحت تو عقلمند ہی قبول کرتے ہیں۔'' (آلِ عمران:8)

حضور اکرم ﷺ کی خدمت اقدس میں ایک صحابی حاضر ہوئے اور آپ ﷺ نے سورۃ زلزال کی یہ آیت تلاوت کی:

فمن یعمل مثقال ذرة خیرا یره۔ ومن یعمل مثقال ذرة شرا یره۔

''جس نے ذرہ بھر نیکی کی ہوگی، وہ اُس کو دیکھ لے گا۔ اور جس نے ذرہ بھر برائی کی ہوگی، وہ اُس کو دیکھ لے گا۔'' (الزلزال:7-8)

اس آیت کو ہم میں سے بہت لوگوں نے پڑھا ہے لیکن بغیر سوچے سمجھے گزر گئے، لیکن یہ آیت اس صحابی کے دل میں اُتر گئی۔ اس نے عرض کیا:

''یارسول اللہ (ﷺ) بس پوری زندگی کے لئے مجھے یہ بات کافی ہے۔''

یہ ہے محکم آیت اور اس پہ عمل کا محکم ارادہ یعنی عزم بالجزم۔

سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد ہے:

''جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے مُبہم رکھا' اسے تم بھی مُبہم رہنے دو۔''

ہمیں متشابہات کی کرید میں نہیں پڑھنا چاہئے کیونکہ ان کا جاننا اگر ہمارے لئے ضروری ہوتا تو اللہ تعالیٰ ہمیں اِس کا علم ضرور عطا کر دیتے۔ اس کا بتایا جانا چونکہ ضروری نہیں تھا' اس لئے اللہ تعالیٰ نے نہیں بتایا۔

اِس کی مثال یوں ہے کہ اگر کوئی نجومی کسی شخص کے بارے میں یہ پیش گوئی کرے کہ اُس کی موت کار کے حادثے کی صورت میں ہوگی۔ موت تو دس بیس یا چالیس سال بعد جانے کب آئے لیکن کار میں سفر کرنا وہ آج ہی سے ترک کر دے تو اُس کا کتنا بڑا نقصان ہوگا؟ اِسی لئے غیر نافع علم کے حصول سے اللہ اور اس کے رسولِ مقبول علیہ ﷺ نے روک دیا۔ محکم باتوں پر محکم طریقے سے عمل کیجئے' فرقہ واریت خود بخود ختم ہو جائے گی۔ اے کاش! آج سیدنا عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا کوئی جانشین ہوتا اور متشابہات میں پڑنے والوں کی ویسے ہی پٹائی کرتا جیسا کہ انہوں نے کی تھی۔ اس کے نتیجے میں فرقہ واریت کی ساری لعنتیں ختم ہو جاتیں۔ پھر سب مسجدیں صرف اللہ کی ہوتیں اور ہمیں جمع کرنے کا ذریعہ ہوتیں۔ ہمارے دلوں اور ہماری صفوں کو الگ تھلگ کرنے کا باعث نہ بنتیں۔ ان مسجدوں سے ہمیں سکون و اطمینان اور روحانیت کے علاوہ انسانیت کا درس ملتا۔ لیکن جب ہم محکمات کو چھوڑ کر متشابہات میں پڑ گئے تو یہی نماز اور مسجد جو ہماری جمعیت کا موجب تھی' شکست و ریخت اور تقسیم کا سبب بن گئی۔ حضور اکرم ﷺ نے نماز کے بارے میں فرمایا تھا ''الصلوٰۃ جامعۃ'' نماز جمع کرنے والی ہے۔

اختلافات کی وجوہات

اختلافات بنیادی طور پر دو وجوہات سے پیدا ہوتے ہیں۔ ایک بے علمی اور جہالت اور دوسرے موقع پرست لوگوں کی سرکشی جو دوسروں کی بے علمی و جہالت سے فائدہ اٹھا کر ان میں اختلافات پیدا کرتے ہیں۔

پہلی وجہ

ہمارے ہاں ہزار افراد میں سے ایک آدمی مشکل ہی سے ملتا ہے جس نے قرآن مجید کو اول سے آخر تک سمجھ کر پڑھ رکھا ہو۔ اس بے خبری اور بے علمی کی صورت میں ایک لال بجھکڑ کھڑا ہو جاتا ہے اور اُلٹی سیدھی باتیں کر کے چند افراد کو اپنے پیچھے لگا لیتا ہے۔ اِدھر اِسی نوع کا ایک دوسرا آدمی بھی چند افراد کو پیچھے لگا کر لے ڈوبتا ہے۔ یوں فرقے پیدا ہوتے ہیں اور فرقہ واریت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اگر ہمیں قرآن مجید اور احادیث مبارکہ کا تھوڑا سا بنیادی علم ہوتا تو اس لال بجھکڑ سے اثر قبول نہ کرتے اور اُسے اپنی من مانی کرنے سے روک دیتے لیکن موجودہ حالات میں ہم اُسے منع کرنے کی حالت میں نہیں کیونکہ ہم نے قرآن پاک اور احادیث مبارکہ کا مطالعہ ہی نہیں کیا۔

دوسری وجہ

دوسرا سبب قرآن خود بتاتا ہے کہ یہ وہ موقع پرست لوگ ہیں جو قرآن پاک کے متعلق ہماری اس بے علمی اور جہالت سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اُن کے ہاں علم تو ہوتا ہے لیکن وہ اخلاص اور نیک نیتی سے خالی ہوتے ہیں۔

وما اختلف فيه الا الذين اوتوه من بعد ماجآء تهم البينت بغياً بينهم ○ (البقرہ:215)

''اس میں اختلاف بھی اُن لوگوں نے کیا جن کو کتاب دی گئی تھی باوجود یہ کہ اُن کے پاس کھلے ہوئے احکام آچکے تھے (اور یہ اختلاف اُنہوں نے صرف) آپس کی ضد سے (کیا)۔''

علم کے متعلق مولانا جلال الدین رومیؒ نے کیا خوب ارشاد فرمایا ہے:

علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

اس کا علاج سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ نبی اکرم ﷺ کا اتباع کیا جائے۔ اُنہی کی تعلیمات اور ارشادات کو مقصودِ حیات بنایا جائے اور اُن کے فرمودات اور اعمال صالحہ کو نصب

الیمین ٹھہرایا جائے۔

یہود و نصاریٰ کی سازشیں

سورۂ آلِ عمران میں ان شرارتوں اور سازشوں کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو یہود و نصاریٰ مسلمانوں اور اسلام کی دشمنی اور عداوت میں کیا کرتے تھے۔ لیکن قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن پاک ان مخالفینِ اسلام کی برائیوں اور سازشوں کا ذکر کرتے ہوئے بھی حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ اگر یہ سازشیں اہل کتاب کے ایک گروہ کی طرف سے کی جارہی ہوں تو اِن کا الزام اہل کتاب پر نہیں دیا گیا بلکہ جگہ جگہ اِس بات کی وضاحت بھی کر دی گئی کہ اہل کتاب کا ایک گروہ اِن سازشوں میں ملوث ہے۔ اِن سازشوں کا ذکر کرتے ہوئے قرآن پاک میں ارشاد ہوا ہے:

وقالت طائفة من اهل الكتب امنو بالذى انزل على الذين امنو وجه النهار وا كفروا اخرة لعلهم يرجعون ٥ولا تومنوا الا لمن تبع دينكم ٥

''اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے' اُس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اُس کا انکار کر دیا کرو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں اور تم اپنے دین کی پیروی کرنے والے کے سوا اور کسی کی بات کا اعتبار نہ کیا کرو۔'' (آل عمران: 72-73)

اس سازش کا مقصد اول تو مسلمانوں کے اعتماد کو متزلزل کرنا تھا۔ دوسرے اپنی قوم کے لوگوں کو اسلام اور مسلمانوں کی طرف راغب ہونے سے بچانا تھا۔ چونکہ پہلے اسلام قبول کرنے اور بعد ازاں اس سے انکار کرنے سے دوسرے لوگوں کا اعتماد و ایمان متزلزل ہوسکتا تھا اور اُن کے دل میں اسلام کے خلاف وسوسے پیدا ہوسکتے تھے' اسی لئے یہ سازش تیار کی گئی۔ اِس کا ایک اور مقصد مسلمانوں کے اندر گھس کر اسلام کی اصل شکل کو مسخ کرنا تھا۔ یہ کام تو آج بھی اسلام دشمن قوتیں پوری تندہی سے انجام دینے میں مصروف ہیں۔

یہود و نصاریٰ کی اِس اسلام دشمنی نے ان کو اس بات پر بھی مائل کر دیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے

خلاف غلط شرعی فتوے جاری کریں۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

ومن اهل الكتب من ان تامنه بقنطار يوئده اليك ومنهم من ان تامنه بدينار لا يوئده اليك الا ما دمت عليه قائما ذلك بانهم قالوا ليس علينا في الامين سبيل و يقولون على الله الكذب وهم يعلمون٥

''اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر اُن کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو مانگنے پر لوٹا دیں گے اور اُن میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم اُن کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اُس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم اُن کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ یہ اِس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ اِن ناخواندہ لوگوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں۔ (آلِ عمران: 75)

یہاں پر اس دلیل کے ذریعے سے کہ یہود و نصاریٰ مسلمانوں کے ایک دینار کی خیانت کرنا بھی عین ثواب سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس بات کی تنبیہ کر رہے ہیں کہ جب ان یہود و نصاریٰ کی دشمنی اور حسد اس حد تک بڑھا ہوا ہے تو اُن سے کس طرح توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے حق میں اپنی زبان سے کوئی سچی بات نکالیں گے یا پھر اُنکی خیر خواہی کیلئے کوئی مشورہ دینگے۔ اگر کبھی اِن کے مشوروں میں کوئی خیر خواہی نکل آئے تو دراصل اُن کے اندر مسلمانوں کے لئے کوئی نقصان ضرور پوشیدہ ہوگا۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''یہود و نصاریٰ کبھی بھی تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔''

صرف اسلام قابل قبول ہے

قرآن پاک اہل کتاب کو تنبیہ کرتے ہوئے کہتا ہے:

ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الاخرة

من الخسرين○ كيف يهدى الله قوماً كفرو بعد ايمانهم○

''جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اُس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔ اللہ اُن لوگوں کو کس طرح بامراد کرے، جنہوں نے ایمان کے بعد کفر کیا۔'' (آلِ عمران: 85-87)

وہ لوگ جو عقل و شعور رکھتے ہوئے بھی اسلام قبول نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے گناہوں سے توبہ کرتے ہوئے اللہ کی بتائی ہوئی راہ اختیار کرتے ہیں، اُن کے بارے میں ارشاد باری تعالیٰ ہے

اولٓئك جزآؤهم ان عليهم لعنة اللّٰه والملئكة والناس اجمعين○ خلدين فيها لايخفف عنهم العذاب ولا هم ينظرون○

''ان لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ اُن پر اللہ کی، اُس کے فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہوگی وہ اس (جہنم کی آگ) میں ہمیشہ رہیں گے۔ نہ اُن کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ اُن کو مہلت ہی دی جائے گی۔'' (آلِ عمران: 87-88)

پھر فرمایا کہ تمام انبیاء کا ایک ہی راستہ ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

و اذ اخذ الله ميثاق النبين لما اتيتكم من كتب و حكمة ثم جآء كم رسول مصدق لمامعك لتومنن به ولتنصرنه○

''اور جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا کہ جب میں تم کو کتاب اور دانائی عطا کروں پھر تمہارے پاس کوئی (اور) رسول آئے جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرے تو تمہیں ضرور اس پر ایمان لانا ہوگا اور اُس کی مدد کرنی ہوگی۔'' (آلِ عمران: 81)

یہ ارشاد فرما کر اللہ نے پوچھا: کیا تم اِس کا اقرار کرتے ہو؟ اور اِس عہد کی بھاری ذمہ داری قبول کرتے ہو؟ اُنہوں نے کہا ''ہاں ہم اقرار کرتے ہیں۔'' (جاری)

سانحہ کربلا۔ فتح وشکست کا حقیقی معیار

(صاحبزادہ خورشید احمد گیلانی)

فتح وشکست، ترقی وزوال، نفع ونقصان اور کامرانی وناکامی کے ازل سے آج تک دو پیمانے رائج رہے ہیں، ایک مادی پیمانہ اور دوسرا اخلاقی پیمانہ، اسی طرح دنیا میں دو ہی قوتیں مدمقابل رہی ہیں، ایک قوت وہ جو مادی غلبے کو سب کچھ سمجھتی رہی اور دوسری قوت وہ جو اخلاقی برتری کو معیار ومدار قرار دیتی رہی، ایک کے ہاں مادیت حرف آخر ہے اور دوسرے کے ہاں اخلاقیات سب سے اہم اور بڑی چیز ہے، مشاہدہ یہ رہا ہے کہ بالعموم مادی طاقتوں کو ہر دور میں غلبہ نصیب رہا ہے مگر تاریخ کا فیصلہ اخلاقی قوتوں کے حق میں رہا مشاہدہ کا مطلب حق ہرگز نہیں فقط امر واقعہ ہے کہ ایسا ہوا لیکن اخلاقیات کی برتری امر واقعہ بھی ہے اور امر حق بھی! امر واقعہ اور امر حق میں فرق و امتیاز ہی کیلئے قدرت نے وجدان، حواس اور عقل کی رہنمائی کے ساتھ ساتھ وحی کی ہدایت کا اہتمام کیا ہے، اگر ہدایت وحی کا مفہوم کچھ بھی نہ ہو اور لوگ اِسے نظر انداز کر دیں تو جانوروں کے باڑے اور انسانوں کے معاشرے میں کوئی حد فاصل باقی نہ رہے۔

بیسیوں معاملات میں وجدان رہنمائی کرتا ہے لیکن ایک حد تک، اس کے بعد وہ غیر ضروری ہو جاتا ہے، کئی ایک امور میں حواس کی ہدایت کار آمد ہوتی ہے مگر حواس بھی کچھ آگے جا کر جواب دے جاتے ہیں کیونکہ دنیا کے ہر معاملے کا تعلق صرف سونگھنے، چکھنے، دیکھنے، سننے اور چھونے سے نہیں اس سے ماورائی حقائق ہوتے ہیں جن کی تفہیم کے لئے عقل اور تجربے کی ضرورت پڑتی ہے، عقل محض مادی واقعات واشیاء میں رہنمائی کا کام دیتی ہے، نتائج اخذ کرتی ہے، کلیے وضع کرتی ہے، تجربے کرتی ہے اور مشاہدات کا ایک سلسلہ قائم کرتی ہے اگرچہ دُنیا کا بہت کچھ انحصار مادیت پر ہے اور مادیت کے اصول وفروع اور تجربات ومشاہدات کا دارومدار عقل پر ہے اِس سب کچھ کے باوجود انسانی کائنات میں ہزارہا مقامات ایسے ہیں جہاں عقل اپنی رہنمائی سے دستبردار ہوتی نظر آتی ہی اور اِسے ہونا چاہیے ورنہ دنیا میں خیر وشر، خوب وزشت، حق وباطل،

روح و جسم اور حرام و حلال کے سارے ضابطے ہوا میں تحلیل ہو کر رہ جائیں گے، دنیا بھر کے تمام رشتے اور سلسلے ایک ایک کر کے بکھر جائیں گے سورج اور چاند، گرمی اور سردی، خوشبو اور بدبو، شیریں اور تلخ کی طرح یہ بھی کائنات انسانی کے حقائق ہیں کہ کوئی باپ ہے اور کوئی بیٹی، کوئی ماں ہے اور کوئی بیٹا، کوئی بہن ہے اور کوئی بھائی، کوئی شریر ہے اور کوئی شریف، کوئی چور ہے اور کوئی بھلا مانس، کوئی غبی ہے اور کوئی ذہین، اگر مادیت اور عقل ہی کی رہنمائی حرف آخر ہے تو وہ یہ ثابت کرنے سے عاجز ہے کہ کسی بھی عورت اور ماں میں، کسی بھی مرد اور باپ میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص گھی خرید کر استعمال کرتا ہے، دوسرا چوری کا استعمال کرتا ہے۔ صحت پر دونوں کا برابر اثر پڑے گا اگر معیار مادیت اور عقل ہو تو ان دونوں افعال میں قطعاً فرق نہیں، کیونکہ نتیجہ دونوں کا یکساں ہے، مگر یہاں وحی کی رہنمائی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جسمانی صحت پر دونوں کا اچھا اثر پڑے گا لیکن روحانی صحت پر، معاشرتی حالت پر، اخلاقی سطح پر دونوں کے اثرات بالکل مختلف ہوں گے۔

بنا بریں فتح و شکست، زوال و عروج میں بھی فقط مادی پیمانے فیصلہ کن نہیں بلکہ اخلاقی معیار پیش نظر رکھنے سے صحیح نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ حقیقی فتح کیا ہے اور شکست کیا ہے؟ زوال کیا ہے اور عروج کیا ہے؟۔

فرعون و کلیم کی کشمکش، کا انجام محض مادیت اور عقل سے معلوم نہیں ہو سکتا' نمرود و ابراہیم کی آویزش میں عقل فیصلہ کن نہیں یہاں بھی اخلاقی پیمانے دنیا کو صحیح نتائج فراہم کرتے ہیں، اگر تلوار کی جنگ جیتنا بہت اہم ہے تو مقدر کی جنگ ہارنا بھی اسی درجے لائق توجہ ہے جن پر برابر غور کرنا چاہیے، دولت اور پیسہ کی فتح اگر کوئی چیز ہے تو ضمیر کی شکست بھی کوئی معنی رکھتی ہے، اسے صرف وہی نظر انداز کرے گا جو اپنے جینے اور مرنے اور حیوان کے جینے اور مرنے میں کوئی فرق محسوس نہ کرے۔

اگر اخلاقی پیمانے دنیا سے محو کر دیئے جائیں تو نہ فکری ارتقاء باقی رہے اور نہ شوق تجسس، نہ حسن کائنات باقی رہے اور نہ ذوق خودی! زمین کی پیٹھ اور زمین کا پیٹ ایک برابر ہو جائے، غار کا

دور اور خلاء کا عہد یکساں قرار پائے، پتھر کا زمانہ اور ایٹم کا زمانہ اپنا فرق کھو بیٹھے، غیرت اور عزت، خودی اور حمیت، آزادی اور اِستقلال کے الفاظ بے معنی ہو کر رہ جائیں، غلامی، بزدلی، ذلت اور نکبت کا کوئی تصور باقی نہ رہے، اِس لئے ضروری ہے کہ تاریخ انسانی کے عہد بہ عہد واقعات اور حوادث کا جائزہ اخلاقی پیمانے سے لیا جائے تب جا کر معلوم ہو گا کہ عمر بن عبدالعزیزؒ اور چنگیز و ہلاکو میں کیا اور کیسا فرق ہے؟

حضرت نوحؑ عمر بھر قوم کو توحید، تقویٰ اور آخرت کی دعوت دیتے رہے لیکن مٹھی بھر افراد کو چھوڑ کر پوری قوم ان کی مخالف رہی، اور یہی حال کم وبیش تمام انبیاء کرام کا رہا معدودے چند پیغمبر ایسے گزرے ہیں جو اپنے الٰہی مشن کو الف سے یا تک پایہ تکمیل تک پہنچا سکے، مادی معیار کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کیا جائے تو انبیاء کرام، مجددین اور علماء ناکام ہو گئے کیونکہ وہ اپنے مخاطبین کو ہمنوا نہ بنا سکے۔ مگر فی الحقیقت وہ کامیاب رہے وہ اِس طرح کہ جس بات کو حق جانا اِس پر ڈٹ گئے، اور درمیان کے ترغیب اور ترہیب کے تمام مرحلوں میں وہ اپنے مشن سے نہ پیچھے ہٹے اور نہ دستبردار ہوئے اور نہ ہی کسی مصلحت اور منفعت اور خوف اور دباؤ کے باعث جزوی ترمیم اور تخفیف پر آمادہ ہوئے نظریات اور اخلاقیات کی دنیا میں فتح و کامرانی اِسی کا نام ہے، مخالفین تب کامیاب کہلاتے جب وہ انبیاء صلحاء کو خرید کر یا دبا کر اصولوں سے منحرف کر دیتے اور انبیاء و صلحا تب ناکام کہلاتے جب وہ کسی مصلحت کا شکار ہو کر یا تشدد سے مجبور ہو کر اپنا راستہ چھوڑ دیتے، ارباب دنیا کی یہ فتح کیا مفہوم اور وزن رکھتی ہے کہ اشراف اور اتقیاء کو گھر سے نکال دیا، جلاوطن کر دیا یا شہید کر دیا، جب کسی مرحلے پر تشدد کی زبان کا آغاز ہوتا ہے تو گویا اپنی شکست کا واضح اعلان ہوتا ہے۔

بلاشک و ریب وہی کامیاب اور سرخرو ہوئے جو نیل کی موجوں سے لڑے، آگ کے الاؤ میں کود پڑے، سولی دیکھ کر نہ ڈرے، طائف کی گھاٹی میں جا کھڑے اور کربلا سے واپس نہیں مڑے تھے۔

سلام مابر سانید ہر کجا ہستند

اب ہم خاص طور پر سانحہ کربلا کے پس منظر میں فتح و شکست کا جائزہ لیتے ہیں اور تاریخ کی

شہادت ریکارڈ کرتے ہیں، تمام تر تفصیلات سے قطع نظر کرتے ہوئے تین بنیادی نکات پر بحث کرتے ہیں جن سے فتح و شکست کا فیصلہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔

☆ یزید کا خیال تھا کہ امام حسینؓ کسی وقتی اشتعال اور ہنگامی جذبے کے تحت میرے مقابلے پر اُتر آئے ہیں ان سے سختی برتی جائے تو وہ خود اپنے مطالبے سے دستبردار ہو جائیں گے یا ان کے بعد ان کے خاندان والے پچھتائیں گے کہ ہم سے غلطی ہو گئی اور مفت میں اپنا گھر اُجاڑ بیٹھے، کیا شہادت حسینؓ کے بعد ایسا ہوا؟

☆ دُنیا کا دستور یہ ہے کہ ہر کوئی اِس کا ساتھ دیتا ہے جو طاقتور اور غالب ہو، جو بے سروسامان ہو اول تو کوئی اِس کا ساتھ نہیں دیتا اگر دے بیٹھے تو طاقتور کو دیکھ کر ساتھ چھوڑ دیتا ہے، اور غالب اور فاتح کے ساتھ آ ملتا ہے کیا کربلا میں ایسا ہوا؟

☆ یزید سانحہ کربلا کے بعد توقع کرتا تھا کہ اب آئندہ کے لئے میری حکومت جائز اور میرا طرز حکومت جاری اور قائم رہے گا، کیا حادثہ کربلا کے بعد اس کا یہ خیال بارآور ہو سکا؟

تاریخ کا ایک ایک حوالہ سانحہ کربلا کے واقعات اور نتائج کو اِن تینوں کسوٹیوں پر پرکھنے کے بعد امام حسینؓ کی شہادت دیتا ہے کہ۔

جو دلوں کو فتح کر لے وہی فاتح زمانہ

اولاً۔ یزید کا خیال سرے سے پوچ اور لغو تھا کہ امام حسینؓ کسی وقتی جوش کے نتیجے میں صف آراء ہوئے ہیں، امام حسینؓ پورے شعور اور وثوق کے ساتھ یزید کی حکومت کو ناجائز، غیر اسلامی اور خلافت راشدہ کے برعکس بلکہ خلافت کی عین ضد سمجھتے تھے، ہنگامی اشتعال جس قدر تیزی سے پیدا ہوتا ہے اِسی تیزی سے ختم بھی ہوتا ہے، مگر حضرت امامؑ تو ۹ ذی الحجہ سے ۱۰ محرم تک برابر ایک ہی بات کرتے رہے کہ یزید کی حکومت میں حدود اللہ پامال کی جا رہی ہیں اور شریعت کے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیا جا رہا ہے، آپ پر موت کا وار اچانک نہیں ہوا کہ سنبھلنے، پلٹنے یا یزید سے مفاہمت کا موقع نہ مل سکا ہو، بلکہ آپ کا ایک ایک قدم شعوری طور پر مقتل کی طرف بڑھ رہا تھا اور شب عاشورہ میں آپ نے اپنے رفقاء سے کہہ دیا کہ جو جانا چاہے جا سکتا ہے میری طرف سے

کوئی ملامت نہیں ہوگی گویا آنے والے دن کی ہولناکی اور تشدد کی دھندلی بلکہ یقینی تصویر آپ کی آنکھوں کے سامنے تھی حتیٰ کہ یوم عاشور کو آپ نے یزیدیوں سے برملا فرما دیا کہ "موت تک تو میں خود تمہارے ساتھ جانے کو تیار ہوں اس سے آگے تم میرا کیا بگاڑ سکو گے؟"۔ آپ کے رفقاء اور عزیزان گرامی کسی ایک جھپٹ میں نہیں مارے گئے بلکہ ایک ایک سوئے مقتل روانہ ہوا، اور امام حسینؓ دن بھر رفیقوں اور عزیزوں کے لاشے وصول کرتے اور دفناتے رہے، بڑے سے بڑا جاگیردار اور سورما بھی اپنے، جوان اور گود کھیلتے بیٹے کی لاش دیکھ کر غش کھا جاتا ہے، مگر یہاں بجز **انا للہ وانا الیہ راجعون** پڑھنے کے اور کسی جذباتی ردعمل کا مظاہرہ دکھائی نہیں دیتا، ہنگامی اور ناپختہ جوش کا حباب پھٹنے کیلئے ایک ہی ساتھی کی شہادت کافی تھی، لیکن خیام اہل بیت میں تو شہادتوں کا جشن برپا تھا۔ جس حوصلے اور ہمت سے، جس صبر اور استقامت سے، امام حسینؓ نے سفر شہادت کے مرحلے طے کئے اور اپنے اصول اور عقیدے تو کیا اپنے گھوڑے کے سم کی گرد اور خیمے کی طناب تک کا سودا نہیں کیا اس کا عشر عشیر بھی یزید اور اس کے حواریوں کو درپیش ہوتا تو حسین رضی اللہ عنہ نے تو اپنا خیمہ نہیں چھوڑا وہ اپنی کرسی اقتدار چھوڑ کر ضرور بھاگ جاتے، بھوک، پیاس، رفقاء اور اعزاء کی بے کسی کوئی معمولی عوامل نہ تھے جو وقتی جوش کو ٹھنڈا نہ کر دیتے مگر امام حسینؓ ایک دائمی حقیقت صفحہ ہستی پر رقم کرنا چاہتے تھے کہ ہر شخص ضروری نہیں کہ قابل خرید و فروخت ہو اور ہر اصول لازمی نہیں کہ مفاہمت آشنا ہو' جابر اور متکبر لوگ کسی اصول کے علمبردار کو تو موت کے گھاٹ اُتار سکتے ہیں لیکن اصول کو فنا کے گھاٹ نہیں اُتار سکتے، اصول کسی کے اقتدار سے زیادہ قیمتی، اور زیادہ طاقتور ہوتا ہے، کسی شخصیت کا اِس استقلال اور پامردی سے اپنا آپ قربان کر دینا ظاہر ہے ضمیر اور شعور کا فیصلہ ہو سکتا ہے کسی وقتی اُبال کا نتیجہ ہرگز نہیں، یزید کے خیال کا دوسرا پہلو کہ اگر امام حسینؓ اپنی ضد پر اڑے رہے تو انہیں بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑے گا جس کا اثر ظاہر ہے پورے خاندان پر پڑے گا یوں باقی ماندہ لوگ پچھتائیں گے اور مفاہمت پر آمادہ ہو کر میری حکومت کو جائز مان لیں گے اور تاریخ میرے استحقاق حکومت کو درست قرار دے گی، یہ پہلو بھی اتنا ہی ناقص، ناپختہ اور بر خود غلط ثابت ہوا۔ نقصان سے وہ ڈرتا ہے جو کسی نفع کے لالچ

سے کام کرے جو اصول کو دنیا بھر کی دولت اور منفعت سے زیادہ وقعت دے اس کا کوئی بھی اقدام نفع ونقصان کے میزانیے سے منسلک نہیں ہوتا اس اصول کا برقرار رہنا ہی سب سے بڑا نفع ہے، اور جان ومال کی بہتر قیمت! اور یہی کچھ حضرات امام حسینؓ کے پیش نظر تھا اس سے ہٹ کر ذرا بھی کچھ ہوتا تو مقام شبیری بھی حقیقت ابدی کا درجہ حاصل نہ کر پاتا۔

رہا سوال پسماندگان کے پچھتانے کا، تو خانوادہ نبوت کے لوگ آغوش حسینؓ کے پروردہ تھے انہیں اپنے نانا کی میراث اور سبق یاد تھا کہ آپ نے سورج اور چاند ملنے پر بھی اپنے الہیٰ مشن سے دستبردار ہونے کے متعلق کبھی سوچا بھی نہیں تھا، شہادت سرفرازی کا نام ہے رسوائی کا نہیں، کہ پچھتانے کی نوبت آجائے، تاریخ کا ایک واقعہ ہمارے استدلال کو بنیاد فراہم کرتا ہے۔

یزید کے دربار میں جب حضرت زین العابدینؒ کو پیش کیا گیا اور یزید نے بڑے نرم مگر منافقانہ انداز میں آپ سے گفتگو کرتے ہوئے سانحہ کربلا پر مصنوعی رنج کے اظہار کے ساتھ ساتھ جب یہ کہا کہ اگر آپ کے والد اپنی ضد چھوڑ دیتے اور ہماری بات مان لیتے تو آج یہ دن آپکو اور آپ کے خاندان کو نہ دیکھنے پڑ آئے اور یوں مستورات دربدر نہ ہوتیں۔ اس جملے پر حضرت امام زین العابدینؒ بھڑک اُٹھے اور فرمایا۔

(اما علمت ان القتل لنا عادة والشهادة لنا سعادة) "یعنی تم لوگوں کو اب بھی علم نہیں ہوسکا کہ قتل ہونا ہماری عادت اور شہادت ہمارے لئے باعث سعادت ہے"۔ آپ کے اس پرعزم اور غضب آلود جملے نے یزید اور اس کے حواریوں کی ساری چالبازی اور نمائشی شان وشوکت کے غبارے سے ہوا نکال کر رکھ دی، جس چیز کو یزید بزعم خویش موجب ندامت سمجھ رہا تھا اسے خاندان رسول باعث سعادت قرار دے رہا تھا، سانحہ کربلا کے وقوع پذیر ہونے کے بعد آج تک امام زین العابدینؒ تو کجا آل رسولؐ سے تعلق رکھنے والے کسی ادنیٰ سے فرد نے بھی کسی پچھتاوے کا اظہار نہیں کیا بلکہ تاریخ کے مختلف موڑ متعدد اشارے دے کرتا تے رہے کہ یزید ہو جیسے حکمرانوں کے بارے میں نرم گوشہ رکھنے والے محقق اور مورخ سانحہ کربلا کی توجیہ اس انداز میں کرتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح یزید کو اس پورے قضیئے سے الگ ثابت کیا جائے اور

بتایا جائے کہ اس میں بعض منافق اور نادان لوگوں کا دوہرا کردار ایسا تھا کہ نوبت کشت وخون تک پہنچ گئی، ورنہ یزید یہ کچھ نہیں چاہتا تھا وغیرہ اِسکا واضح مطلب یہ ہے کہ یزید کو اپنے طرزِ عمل پر پچھتانا پڑا اور وہ کسی حیلے بہانے اپنی برات کا اظہار کرتے رہے کہ یہ واقعہ یوں نہیں تھا، اس کا مقصد یہ نہیں تھا، حقائق یہ نہیں یہ ہیں کیا یہ ساری باتیں اس امر کی غماز نہیں کہ اخلاقی معیار اور پیمانہ امام حسینؓ کو فاتح قرار دیتا ہے اس لئے کہ پچھتاوا، وضاحت، معذرت، توجیہ، تعبیر، گریز، برات یہ اشارے یزید سے منسوب ہیں امام حسینؓ اور ان کے مداحین اور پیرو کاروں سے کسی دروغ گو مؤرخ نے بھی منسوب نہیں کئے، یزید کے یہ سارے الفاظ شکست کا پتہ دیتے ہیں، فتح مندی کی علامت ہرگز نہیں ہیں، اسی اخلاقی فتح نے رہتی دنیا تک یزید کو آمریت اور حسینؓ استقامت کی علامت بنا دیا ہے۔

اسی کے ساتھ یزید نے مدینہ منورہ پر چڑھائی کا ارادہ ظاہر کیا تو ابن زیاد نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ تم آخر کیا چاہتے ہو پہلے نواسہ رسول ﷺ کو شہید کیا اب مدینۃ الرسول کو پامال کرنا چاہتے ہو لعنت کا یہ طوق اب میں اپنے گلے میں ڈالنے کو ہرگز تیار نہیں۔

سانحہ کربلا کے بعد یزید کے یہ الفاظ کہ ”لعنت ہو ابن مرجانہ (ابن زیاد) پر جس نے مجھے رسوا کر دیا ہے“ تاریخ کی مستند کتابیں اپنے دامن میں یہ قوی شواہد رکھتی ہیں کہ سانحہ کربلا کے بعد کئی عورتوں نے اپنے شوہروں سے طلاق لے لی کہ وہ قتل حسینؓ میں ملوث مردوں کے چہرے دیکھنا گناہ سمجھتی تھیں، بعض کی اولاد نے اپنے باپ کی گھر آمد پر دروازوں کی کنڈیاں چڑھا لیں کہ وہ ان منحوس شکلوں کو کیسے دیکھیں جو قتل حسینؓ کے گناہ میں شریک رہیں۔

بہت بعد میں جا کر بنو اُمیہ ہی کے عمر بن عبدالعزیزؒ نے حکم جاری کیا کہ جو شخص یزید کو امیر المومنین کہے گا اسے بیس کوڑے مارے جائیں گے، کیا آج تک کسی ایک مسلمان نے بھی امام حسینؓ کے دامن سے اپنا تعلق توڑنے کا عندیہ دیا ہے؟ ہرگز نہیں وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہارنے والوں سے ہر کوئی اظہار برات کرتا ہے جیتنے والوں سے تو وہ بھی اپنا قرب ظاہر کرتے ہیں جو حقیقت میں قریب نہیں ہوتے، ہر شخص کا ناک چڑھا کر یزید سے اظہار برات کرنا اور ہر مسلمان

کا، لپک لپک کر خود کو دامن حسینؓ سے وابستہ کرنا گویا اس فیصلے پر مہر ثبت کرنا ہے کہ اخلاقی دنیا میں فتح کا تاج امام حسینؓ کے سر پر سجا ہے اور یزید کے چہرے پر آج تک شکست کی دھول اُڑ رہی ہے۔

ثانیاً۔ دوسرا معیار جو عمومی سطح پر مسلمہ ہے کہ انسانی زندگی میں آزمائش، بحران اور اُتار چڑھاؤ بہر حال آتے رہتے ہیں، اور کوئی شخص اگر کسی تحریک، جماعت، خاندان یا فوج کا سربراہ ہے یا وہ کسی نظریے اور اصول کا علمبردار ہے تو اس کی زندگی میں آزمائش اور بحران کا آنا عین متوقع بلکہ یقینی ہوتا ہے کیوں کہ مخالف قوتیں بھی اپنی جگہ برسر عمل اور متحرک ہوتی ہیں، اور اس کے لئے آزمائش کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، ایسے میں ہوتا یہ ہے کہ اگر وہ بااصول اور نظریاتی انسان خود لغزش کھا جائے تو کچھ لوگ ضمیر اور ایمان کے باعث اسے چھوڑ جاتے ہیں کہ یہ اس منصب اور رہنمائی کے قابل شخص نہیں، اگر وہ حالات کے حصار میں گھر جائے اور مقابلے کے لئے برابر کی قوت اور استطاعت نہ رکھتا ہو تو کچھ اور وقتی مفادات کے طلبگار افراد اس سے الگ ہو جاتے ہیں۔ اِس لئے کہ ایسے لوگ کسی کے ساتھ فائدے کی خاطر چلتے ہیں، بحران اور آزمائش کے لئے نہیں، ایسی ذہنیت کے حامل افراد ہمیشہ چڑھتے سورج کی پوجا کرتے اور محفوظ کنارے کے ساتھ لگنے کے عادی ہوتے ہیں۔

سانحہ کربلا کے پس منظر میں دیکھیں تو واضح ہو جاتا ہے کہ کون کس پانی میں تھا؟ دنیا کے عمومی رواج کے مطابق یزید اس لائق تھا کہ ہر کوئی اس کا ساتھ دیتا اور حسینؓ اس حال میں تھے کہ ساتھی بھی ان کو چھوڑ جاتے، ۶۱ ھ کا منظر یہ تھا کہ یزید کا اقتدار نصف النہار پر تھا اور حسینؓ کی شام زندگی ڈھلنے والی تھی یزید محفوظ کنارا تھا اور حسینؓ آزمائش کے بیچ منجدھار میں، یزید کے پاس دینے کو بہت کچھ تھا مگر حسینؓ خود تو کیا دیتے الٹا رفقاء دینے کی پوزیشن میں تھے اپنی جان کا نذرانہ، یزید کی بساطِ اقتدار پر انواع و اقسام کی چیزیں بچھی تھیں عہدہ، دولت، ترقی، ناموری، اور حسینؓ کے دستر خوان پر سوکھے ٹکڑے تو تھے مگر پانی کا ایک گھونٹ بھی نہیں، ایسے میں لوگوں کا رجحان کس طرف ہونا چاہئے؟ اس کو سمجھنے کے لئے عقل کی غیر معمولی مقدار مطلوب نہیں، حالات بھی واضح اور نتائج بھی واضح، لیکن یہ ساری باتیں مادی دنیا اور اس کے وضع کردہ پیمانوں کی ہیں، اخلاقی دنیا کے

ضابطے مختلف واقع ہوئے ہیں، ایک واقعہ بطور دلیل ہمارے مدعا کو واضح کردے گا۔

شب عاشور رات گئے امام حسینؑ نے اپنے رفقاء کو طلب کیا، پیش آنے والے واقعات کو بلا کم و کاست بیان کیا، مستقبل کی تصویر کے خدوخال نمایاں کئے اور ساتھ ہی فرمایا کہ چراغ گل کردیا جائے، گھپ اندھیرے میں آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کی رفاقت اور ہمدردی کا میں بے حد شکرگزار ہوں یزیدیوں کو تم سے نہیں مجھ سے پرخاش ہے، میرا وجود بذات خود اس کی حکومت کے ناجائز ہونے کی دلیل ہے وہ مجھے راستے سے ہٹا کر ہی مطمئن ہوگا اس سے کم کسی حال میں اور شرط پر نہیں، میرا مشورہ اور میری طرف سے تم سب کو اجازت ہے کہ جو جہاں جاسکتا ہے چلا جائے، میں بچ گیا تو بھی ملامت نہیں کروں گا، شہید ہوگیا تو بھی آخرت میں کوئی گلہ نہیں کروں گا، آپ کی اس تقریر کے بعد اتنی دیر تک چراغ گل رہے کہ جانے والے آسانی جاسکیں مگر روشنی ہونے پر معلوم ہوا کہ ایک بھی ساتھی اور فداکار اٹھ کر نہیں گیا، اور یہ سبھی لوگ تادم آخریں آپ کے ساتھ رہے۔

دوسری طرف دیکھئے کہ اگر یزید اس طرح کا اختیار اپنے لوگوں کو دیتا اور لوگوں کو یقین ہوتا کہ وہ ہم سے فریب نہیں کررہا تو کیا خیال ہے کتنے لوگ یزیدی لشکر میں باقی رہ جاتے؟ اول تو یزید اور اس کے حواری اس پیش کش کی جرات نہ کرتے کہ آج تک کسی فرعون، نمرود، شداد، چنگیز، ہلاکو، ہٹلر اور مسولینی نے ایسی جرات نہیں کی اور وہ یہ پیش کش کر بیٹھتا تو دنیا تماشہ دیکھتی، کہ جبر کے زیرسایہ رہنے کے لئے کتنے لوگ تیار ہیں؟ اس مرحلے پر یہ واقعہ پورا منظرنامہ بدل دیتا ہے کہ خیمہ حسینؑ جہاں بھوک، پیاس، بے کسی اور درماندگی نے ڈیرے ڈال رکھے ہیں اور نوبت جان بچانے کے شرعی فریضے تک پہنچی ہوئی تھی وہاں سے کوئی نکل کر باہر نہیں آیا، لیکن یزیدی لشکر کا کمانڈر حر تمام پرکشش ترغیبات اور متوقع ترقیوں کو لات مار کر اور عتاب شاہی کا خطرہ مول لے کر امام حسینؑ کی مسافرت، عسرت اور شہادت میں حصہ دار بنتا ہے، جس وقت وہ کیمپ بدلنے کا ارادہ کرتا ہے ایک شمہ برابر موہوم خیال بھی نہیں کہ امام حسینؑ کے ساتھ ملنے میں دنیا کا کوئی فائدہ ہوسکتا ہے، یعنی ایسا تو ہوتا ہے کہ لوگ فوری کی بجائے ذرا دوررس فائدہ دیکھ کر وقتی طور پر

''غازیوں'' میں شامل ہو جاتے ہیں لیکن میدان کربلا میں تو صرف اخلاقی اور اخروی فلاح کا داعیہ ہی کسی کو غالب گروہ سے الگ کر کے بظاہر مغلوب اور معتوب گروہ میں شامل کرسکتا تھا۔

وہ جو ایک معیار ہے چڑھتے سورج کی پوجا کا، محفوظ کنارے کے ساتھ لگنے کا، طاقتور کی ہاں میں ہاں ملانے کا، اور فائدہ دیکھ کر وفاداری بدلنے کا، یہ سب مادی معیارِ فتح وشکست ہے جسے سانحہ کربلا پر منطبق کیا ہی نہیں جا سکتا، یہاں تو جذبہ ہی دوسرا کارفرما ہے جسے اہل دنیا نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے۔

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

ثالثاً۔ یزید اور اس کے عمال حکومت کا ایک بے بنیاد خیال یہ تھا کہ امام حسینؑ کی شخصیت ہمارے راستے کا روڑا ہے اگر اسے ہٹا دیا جائے تو حکومت کرنا آسان ہو جائے گا، یزید نے جبر اور لالچ کی بنیاد پر اپنی حکومت تو قائم کر رکھی تھی مگر اسے اس کے اخلاقی اور شرعی جواز کا مسئلہ درپیش تھا۔ وہ خود اسی کمپلیکس کا شکار رہا، وہ سمجھتا تھا کہ حسینؑ کے پاس کوئی لاؤلشکر نہیں، دولت اور طاقت نہیں لیکن نواسۂ رسولؐ ہونے کی نسبت بذات خود اتنی قوی اور طاقتور ہے کہ کسی بھی وقت وہ لوگوں کی نفرت کا ہدف بن سکتا ہے، امام حسینؑ نے اگرچہ کوئی جتھہ بندی نہیں کی تھی، مسلح لشکر تیار نہیں کیا تھا اور اس طرح کا بظاہر کوئی خوف یزید کو لاحق بھی نہیں تھا مگر وہ آپ کو سویا ہوا شیر سمجھتا تھا جو کسی وقت بھی کروٹ بدل سکتا ہے، سو اسی خوف اور خدشے نے اسے انتہائی اقدام پر مجبور کیا اس اقدام کو ہر جابر حکمران اپنی بہادری بنا کر پیش کرتا ہے جبکہ درحقیقت یہ اس کی بزدلی کا اظہار ہوتا ہے جب اس کی دلیل کی زبان گونگی ہو جاتی ہے تو وہ تلوار کی زبان چلانا شروع کر دیتا ہے، المختصر کربلا میں وہ سب کچھ ظہور پذیر ہو گیا جو یزید کو مطلوب تھا، امام حسینؑ اور ان کے جان نثار رفقاء منظر سے ہٹ گئے مگر کیا یزید کو وہ کچھ بھی نصیب ہو گیا جو فی الاصل اس کا مدعا تھا؟ اس کا جواب تاریخ نفی میں دیتی ہے، وہ دن اور آج کا دن یزیدی طرز حکومت عامتہ المسلمین کے نزدیک انتہائی ناپسندیدہ شمار ہوتا ہے، اور کوئی ذی ہوش انسان اس کے طرز حکومت کو بحال

کرنا چاہتا ہے اور نہ مثالی سمجھتا ہے۔ یزید کے اس اقدام کو کوئی دردمند انسان جائز سمجھتا ہے اور نہ مستحسن، چودہ صدیوں میں حکومتیں بدل گئیں، حکمران خاندان بدل گئے، طرز ہائے حکومت بدل گئے، ملکوں کے جغرافیے بدل گئے، براعظموں کے نقشے بدل گئے، حتیٰ کہ گردش دوراں نے بودوباش کے طور طریقے بدل ڈالے، لیکن مسلمانوں کی یہ سوچ سرمو نہیں بدلی کہ یزید [illegible] تھا، جفا جو تھا، جابر تھا، نواسہ رسول کا قاتل تھا، ناجائز حکمران تھا اور امور مسلمین کا ناجائز ولی تھا، یزید نے ایک ایسی بازی کھیلی کہ شکست اس کا مقدر بن گئی اور حسینؑ نے ایسی راہ اختیار کی جسے قدم قدم یادگار بنا ڈالا، نہ جانے کتنے قافلہ ہائے انقلاب اس راہ کے ہر ذرے کو اپنی منزل کا ستارہ سمجھتے رہیں گے۔

امام حسینؑ کے خون نے ایک ایسی لکیر کھینچ دی ہے اسلام کے مثالی نظام حکومت اور ملوکیت کے درمیان کہ چودہ صدیاں بعد بھی امت کے اجتماعی ضمیر کے حلق سے ملوکانہ طرز حکومت نیچے نہیں اتر سکا، اگرچہ اس دوران بنوامیہ، بنوعباس، سلاطین عثمانی، خلجی، غوری، مغل، غزنوی، لودھی بہت سے حکمران ہو گزرے ہیں، عامۃ المسلمین نے انہیں اپنا حکمران تو مانا ہے اور چپ بھی رہے ہیں، مگر ان تمام حکومتوں کو کسی نے خلافت راشدہ کا نعم البدل یا اس کے ہم پلہ قرار نہیں دیا، آج بھی کسی دور دراز دیہات میں رہنے والا جب اسلامی حکومت کا تصور اپنے ذہن میں لاتا ہے تو وہ خلافت راشدہ کے مطابق ہوتا ہے۔ بنوامیہ، بنوعباس اور سلاطین ترکیہ اس کے کسی گوشہ دماغ میں نہیں سما پاتے، خون حسینؑ کا یہی سب سے بڑا فیض اور سانحہ کربلا کا یہی سب سے بڑا عطیہ ہے کہ اس نے امت کو غلط فہمی سے بچا لیا ورنہ ہر دوسرا حکمران لبادہ اوڑھ کر خود کو خلفاء راشدین کی صف میں شامل کر لیتا اور لوگوں کے لئے حضرت حسینؑ سے پہلے اور ان کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں کے اسلامی تشخص کے بارے میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا دوسرے لفظوں میں لوگوں کو معلوم نہ ہو پاتا کہ اسلامی حکومت کا سرچشمہ مسجد نبوی ہے یا شام کے شاہی محلات و قصور۔ یزید دراصل اسی فرق کو محو کرنا چاہتا تھا، جو اس بدنصیب سے خانوادہ رسول ﷺ کے صفحہ ہستی سے مٹانے کی بھرپور کوشش کے باوجود وہ فرق محو نہ ہو سکا، بعد کے تمام ادوار ہمارے اس دعوے کی

کرنا چاہتا ہے اور نہ مثالی سمجھتا ہے۔ یزید کے اس اقدام کو کوئی دردمند انسان جائز سمجھتا ہے اور نہ مستحسن، چودہ صدیوں میں حکومتیں بدل گئیں، حکمران خاندان بدل گئے، طرز ہائے حکومت بدل گئے، ملکوں کے جغرافیے بدل گئے، براعظموں کے نقشے بدل گئے، حتی کہ گردش دوراں نے بودوباش کے طور طریقے بدل ڈالے، لیکن مسلمانوں کی یہ سوچ سرمو نہیں بدلی کہ یزید ستمگر تھا، جفا جو تھا، جابر تھا، نواسۂ رسول ﷺ کا قاتل تھا، ناجائز حکمران تھا اور امور مسلمین کا ناجائز ولی تھا، یزید نے ایک ایسی بازی کھیلی کہ شکست اس کا مقدر بن گئی اور حسینؓ نے ایسی راہ اختیار کی جسے قدم قدم یادگار بنا ڈالا، نہ جانے کتنے قافلہ ہائے انقلاب اس راہ کے ہر ذرے کو اپنی تقدیر کا ستارہ سمجھتے رہیں گے۔

امام حسینؓ کے خون نے ایک ایسی لکیر کھینچ دی ہے اسلام کے مثالی نظام حکومت اور ملوکیت کے درمیان کہ چودہ صدیاں بعد بھی امت کے اجتماعی ضمیر کے حلق سے ملوکانہ طرز حکومت نیچے نہیں اتر سکا، اگر چہ اس دوران بنوامیہ، بنوعباس، سلاطین عثمانی، خلجی، غوری، مغل، غزنوی، لودھی بہت سے حکمران ہو گزرے ہیں، عامتہ المسلمین نے انہیں اپنا حکمران تو مانا ہے اور چپ بھی رہے ہیں، مگر ان تمام حکومتوں کو کسی نے خلافت راشدہ کا نعم البدل یا اس کے ہم پلہ قرار نہیں دیا، آج بھی کسی دور دراز دیہات میں رہنے والا جب اسلامی حکومت کا تصور اپنے ذہن میں لاتا ہے تو وہ خلافت راشدہ کے مطابق ہوتا ہے۔ بنواُمیہ، بنوعباس اور سلاطین ترکیہ اس کے کسی گوشۂ دماغ میں نہیں سما پاتے، خون حسینؓ کا یہی سب سے بڑا فیض اور سانحہ کربلا کا یہی سب بڑا عطیہ ہے کہ اس نے امت کو غلط فہمی سے بچالیا ورنہ ہر دوسرا حکمران لبادہ اوڑھ کر خود کو خلفاء راشدین کی صف میں شامل کر لیتا اور لوگوں کے لئے حضرت حسینؓ سے پہلے اور ان کے بعد قائم ہونے والی حکومتوں کے اسلامی تشخص کے بارے میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا دوسرے لفظوں میں لوگوں کو معلوم نہ ہو پاتا کہ اسلامی حکومت کا سرچشمہ مسجد نبوی ہے یا شام کے شاہی محلات وقصور۔ یزید دراصل اسی فرق کو محو کرنا چاہتا تھا، جو اس بدنصیب سے خانوادۂ رسول ﷺ کے صفحۂ ہستی سے مٹانے کی بھرپور کوشش کے باوجود وہ فرق محو نہ ہو سکا، بعد کے تمام ادوار ہمارے اس دعوے کی

دلیل فراہم کرتے ہیں، یزید اتنی بڑی جسارت اور سفاکی کے باوجود تا قیام قیامت اپنی حکومت کے لئے اسلامی اور معیاری ہونے کی سند حاصل نہ کر سکا۔

یزید کی موت کے بعد اس کا بیٹا معاویہ بن یزید برسر اقتدار آیا، اور بہت ہی تھوڑے عرصے میں یہ کہہ کر تخت سے دستبردار ہو گیا کہ "مجھے اس سے خون حسینؓ کی بو آتی ہے اور مجھے بے چین کر دیتی ہے" یہ مختصر سا تبصرہ کئی کتابوں پر بھاری ہے، لاکھوں مربع میل پر محیط سلطنت سے دستبرداری کوئی معمولی واقعہ نہیں، اور اقتدار بذات خود اتنی معمولی چیز نہیں کہ جسے چھوڑ دیا جائے خواہ کسی دیہہ اور گاؤں کا اقتدار ہی کیوں نہ ہو؟ اسی اقتدار کی خاطر لوگ انبیاء کی تکذیب پر اتر آئے، نبی آخر الزماں ﷺ سے برسر جنگ ہوئے، یہی وہ اقتدار ہے جس کی خاطر سگے باپ نے بیٹے کو تہ تیغ کر دیا، اسی کے لئے بھائی بھائیوں کو اندھے کنویں میں تا عمر لٹکا دیتا ہے، بیٹا باپ کی آنکھوں میں آگ سے دہکتی سلائیاں پھیر دیتا ہے، اقتدار کے حصول کیلئے کیا کیا سودے انسان کو نہیں کرنے پڑتے' اپنی غیرت، ناموس، ضمیر اور ایمان کے سودے، تب جا کر یہ نیلم پری ہاتھ آتی ہے، وہ اقتدار ہی تو ہے جس کی خاطر لوگوں نے صلحائے امت کو کوڑے مارنے کا حکم دیا، سر بازار رسوا کیا، انہیں کال کوٹھڑیوں میں دھکیل دیا، اسی اقتدار کے تحفظ کے لئے بادشاہوں نے ہرے بھرے شہر اجاڑ دیئے اور آبادیوں کو تہس نہس کر کے رکھ دیا حتیٰ کہ اسی تخت سلطنت نے یزید کو اتنا حواس باختہ اور اندھا کر دیا کہ اس نے نواسۂ رسول ﷺ تک پر ہاتھ اٹھانا گوارا کر لیا مگر اقتدار سے علیحدگی پر آمادہ نہ ہوا اسے اسلامی خطوط پر لانے کو تیار نہ ہوا۔

معاویہ بن یزید جسمانی اور ذہنی طور پر بھی تندرست تھا یوں نہیں کہ فالج زدہ ہو اور ڈیوٹی سے تنگ آ گیا ہو اور پاگل ہو کہ اسے اقتدار کی اہمیت معلوم نہ ہو تاریخ تو ایسے لوگوں کا بھی ریکارڈ رکھتی ہے کہ مفلوج اور لاشے قسم کے لوگ بھی تا دم مرگ اقتدار سے چمٹے رہے درباری انہیں فوراً ارسطو بلکہ اس سے بڑھ کر مان لیتے ہیں۔

ابن یزید کا یہ اقدام ان ہزاروں منطقی اور سیاسی دلائل سے زیادہ ٹھوس اور واضح ہے کہ یزید کی حکومت ناجائز، آمرانہ، غیر اسلامی اور خلافت راشدہ کے برعکس تھی، ایک اچھے مسلمان کی یہی

نشانی ہے کہ وہ اسلامی حکومت میں چوکیداری کا منصب بھی قبول کر لیتا ہے اور غیر اسلامی ماحول میں بادشاہ بننا بھی پسند نہیں کرتا۔

کوئی دور پرے کا رشتہ دار، پوتا پڑپوتا، یا دوسرے خاندان کا فرد آ کر یزید سے اظہار برات اور حکومت سے علیحدگی اختیار کرتا تو شاید اتنا واضح مؤقف نہ بنتا یہاں تو یزید کا بیٹا اور اسی کا جانشین کسی دباؤ، سازش اور بغاوت کے بغیر یزید کے ورثے پر تین حرف بھیج کر ایک طرف ہو جاتا ہے، اس سے بڑھ کر یزید کی اخلاقی شکست اور امام حسینؓ کی اخلاقی فتح کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے؟

اس سلسلے میں ایک اور دلیل بھی قابل غور ہے، بنو امیہ ہی سے تعلق رکھنے والے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب مسند خلافت پر فائز ہوتے ہیں، تو ان کا پہلے سے لے کر آخری قدم جو بھی اٹھا وہ یزید کے طرز حکومت کے برعکس تھا، اور ان کا ڈھائی سالہ دور حکومت امت مسلمہ کی نظر میں خلافت راشدہ کا ضمیمہ قرار پاتا ہے، آخر کیا وجہ؟

اگر امام حسینؓ کی کشمکش نسلیت پر مبنی ہوتی اور بعض لوگوں کے خیال میں ان کے پیروکاروں نے بھی ایک خاص نسل کو ہدف بنا کر پروپیگنڈہ کیا اور اس سارے واقعے کو تقدس مآب بنا دیا، یہ سوچ اگر ذرا بھی مبنی بر حقیقت ہوتی تو امت بنو امیہ کے ایک فرد کو اس طرح خلفائے راشدین کی صف میں شمار نہ کرتی، یہ صرف منطقی مغالطے اور فکری گمراہیاں ہیں جو بعض لوگوں کو ایسا سوچنے پر اکساتی ہیں، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ خلیفہ راشد اس لئے قرار پائے کہ ان کے جملہ اقدامات اپنے تمام پیش رووں کے برعکس خلفائے راشدین کی حکومتوں کے مطابق تھے، انہوں نے اپنے بارے میں کی گئی وصیت کو عوام کے سامنے پیش کیا، اقتدار سے دستبرداری کا اعلان کر کے لوگوں سے رائے طلب کی تا کہ کوئی دباؤ اور خوف محسوس نہ کرے، اور حکومت سنبھالنے کے پہلے ہی دن جو فیصلے کئے وہی فیصلے یزید اور اس کے بعد آنے والے حکمرانوں کے جملہ اقدامات کو غیر اسلامی اور ناجائز ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں، اور انہی فیصلوں نے حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کو امت کی نگاہ میں عظیم القدر اور خلیفہ راشد کا درجہ دلایا، آپ نے حکومت کے رنگ ڈھنگ کو اوپر سے نیچے تک مکمل طور پر بدل ڈالا اور عامتہ المسلمین پر واضح کر دیا کہ جو کچھ میرے پیش رووں نے

کیا وہ سراسر ظلم اور مبنی بر جبر تھا میں ان سے برات ظاہر کرتا ہوں اور اپنا سلسلہ حضرات خلفاء راشدین سے جوڑتا ہوں۔

امام حسینؓ بھی تو یزید کو یہی سمجھاتے رہے کہ تمہارا انداز حکومت خلافت راشدہ سے قطعی مختلف ہے ان کی اس بات سے یزید اور اس کے حواریوں نے اتفاق نہ کیا مگر حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے آتے ہی انقلابی فیصلوں کے ذریعے حضرت امام حسینؓ کے مؤقف کی تائید بلکہ توثیق کر دی۔

یہ کایا کلپ اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کا اپنے سابقین سے اظہار برات اور خلافت اسلامی کی طرف رجوع واضح کر رہا ہے کہ یزید شکست کھا گیا اور حسینؓ ابدی فتح سے ہمکنار ہوئے۔

مادی سطح پر سوچنے والوں کی نگاہ بس یہیں آکر اٹک گئی کہ یزید تلوار کی جنگ جیت گیا ہے انہوں نے یہ نہیں دیکھا کہ کس کا مؤقف صحیح رہا اور کس کے اصول سر بلند رہے؟ تلواروں کی جنگ جیتنے والے یہ نہیں سوچتے کہ تلواریں زنگ آلود بھی ہو سکتی ہیں، ان کی دھار کند بھی ہو سکتی ہے اور تلواریں اٹھانے والے بازو ضعیف بھی ہو سکتے ہیں، مگر اصول کبھی زنگ آلود نہیں ہوتے، ان کی آب و تاب کبھی نہیں مرتی، اور ان کے علمبردار کبھی ضعف اور کمزوری کا مظاہرہ نہیں کرتے۔

اس ضمن میں اور بھی دلائل موجود ہیں لیکن صرف تین نکات کو بنیاد بنا کر گفتگو کی گئی ہے اور یہ تینوں نکات محض موضوعی نہیں بلکہ معروضی اور خارجی ہیں جنہیں دنیا کی کسی بھی میزان میں تولا جا سکتا ہے یہ تینوں نکات واضح کر رہے ہیں، کہ سانحہ کربلا کی روشنی میں امام حسینؓ کا جوش ہنگامی نہیں تھا، وہ اور ان کے رفقاء میں سے کوئی اپنے کئے پر نہیں پچھتایا، کسی نے حضرت حسینؓ کا ساتھ نہیں چھوڑا اور بعد میں آنے والوں نے جن کا تعلق خود یزید کے خاندان یعنی بنو امیہ سے تھا امام حسینؓ کے مؤقف کی تصدیق کی، جس سے یہ امر متحقق ہو گیا کہ حقیقی فتح سے امام حسینؓ ہمکنار ہوئے اور یزید حقیقی شکست سے دوچار ہوا کہ یہی فطرت کا تقاضا اور تاریخ کا تجربہ ہے۔

ایسے بھی اس جہان میں گزرے ہیں کچھ شہید
مقتول تا ابد رہا قاتل نہیں رہا

احادیث میں تمثیلات

(مولانا شاہ محمد جعفر پھلواروی)

ہر قسم کی مادی تعلیم اور روحانی تربیت کی تکمیل تمثیل وتشبیہہ ہی سے ہوتی ہے اور دنیا کا کوئی لٹریچر خواہ وہ انسانی ہو یا آسمانی اس سے خالی نہ رہ سکا اور نہ یہ ہونا ممکن تھا۔ قرآن نے کس خوبی کے ساتھ تمثیلات سے کام لیا ہے؟ اس کے کچھ نمونے آپ ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ کلام الٰہی کے بعد سب سے زیادہ اہم کلام رسولؐ ہے۔ ہم اس مضمون میں احادیث نبوی سے صرف چند تمثیلاتی نمونے پیش کررہے ہیں۔

مقام نبوت کی تمثیل

اہل مکہ کا دستور تھا کہ جسے کسی اہم معاملے کی اطلاع دینی ہوتی وہ کوہِ صفا پر چڑھ جاتا اور جس جس فرد یا خاندان کو بلانا ہوتا آواز دے کر بلاتا۔ جب سب جمع ہو جاتے تو اُن کو اس معاملے سے آگاہ کر دیتا۔

نبوت کو تیسرا سال تھا اور ابھی چھپ چھپ کر تبلیغ ہوتی تھی۔ جب آیت "**فاصدع بما تومر**" (اوامر کو علانیہ واضح کردو) نازل ہوئی تو اہل مکہ کے رواج کے مطابق حضورؐ صفا کی پہاڑی پر چڑھ گئے اور قریش کے مختلف خاندانوں کو آواز دے کر بلایا۔ حسب دستور لوگ جمع ہو گئے تو حضورؐ نے اُن لوگوں کو پوچھا!

"دیکھو اگر میں تم سے یہ کہوں کہ شہ سواروں کا ایک دستہ دوسری طرف کے دامن کوہ سے تم پر حملہ آور ہونا چاہتا ہے تو تم مجھے سچا سمجھو گے"؟

اُنہوں نے جواب دیا۔

"ہمارا ہمیشہ کا تجربہ ہے کہ تم سچ ہی بولتے ہو"

اپنی صداقت پر حاضرین کی زبان سے مُہر تصدیق ثبت کرانے کے بعد حضورؐ نے موقعے سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فرمایا۔

(رواہ الشیخان الترمذی عن ابن عباس)

اچھا تو مجھے سچا سمجھتے ہو تو ایک سچی حقیقت اور بھی سنو کہ میں تم سب کو ایک بڑھے سخت عذاب کی وارننگ دیتا ہوں۔

اِس واقعے میں تشبیہہ و تمثیل کا کوئی لفظ موجود نہیں۔ لیکن یہ پورا واقعہ ہمہ تن تشبیہہ و تمثیل ہے مقام نبوت کی۔ اور اس سے بہتر تشبیہہ ممکن نہیں۔

حضور ﷺ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں اور سامنے ایک طرف دامن کوہ میں سب لوگ کھڑے ہیں۔ وہ سب حاضرین صرف پہاڑ کے اسی ایک طرف دیکھ رہے ہیں۔ جس طرف وہ خود کھڑے ہیں۔ پہاڑ کی پشت پر اُس طرف کیا کچھ ہے جس کا انہیں کوئی علم نہیں۔ اس لئے کہ بیچ میں پہاڑی حائل ہے۔ مگر حضور ﷺ کی حیثیت یہ ہے کہ پہاڑ کی چوٹی پر کھڑے ہیں اور دونوں طرف دیکھ رہے ہیں۔ نیچے کھڑے ہونے والے لوگوں کو اُس طرف (پس پشت) کی کوئی خبر نہیں ہو سکتی۔ اُن کو اس طرف کی اگر کوئی اطلاع مل مل سکتی ہے تو صرف اُس شخص کے اطلاع دینے سے جو اوپر کھڑا پہاڑ کے دونوں جانب یکساں دیکھ رہا ہے۔ بالکل یہی مثال ہے مقام نبوت کی پیغمبر حال کے اعمال کو بھی دیکھتا ہے اور مستقبل کے نتائج پر بھی اُس کی نظر جمی رہتی ہے۔ وہ دنیا کو بھی دیکھتا ہے اور آخرت کو بھی۔ اس کا تعلق خدا سے بھی ہوتا ہے اور خدا کے بندوں سے بھی۔ ادھر سے لیتا ہے ادھر پہنچا دیتا ہے۔ وہ آغاز کو بھی دیکھتا ہے اور اسی طرح اُسے انجام بھی نظر آتا ہے۔ بندوں کے سامنے ایک رُخ ہوتا ہے۔ پیغمبر کی نگاہیں آخرت پر، انجام پر، غیوب پر، دماغِ انسانی سے وراء الوراء حقائق پر بھی ہوتی ہے اور یہ حقائق انسانوں پر منکشف ہی نہیں ہو سکتے تا آنکہ اُنہیں پیغمبر نہ بتائے۔ عام انسانوں کی نگاہ اور نبوی بصیرت میں جو فرق ہے اُس کی تشبیہہ و تمثیل اس سے بہتر اور کیا ہو سکتی ہے جو حضور ﷺ نے عملی طور پر پیش فرما دی؟

خاتم النبیین کا صحیح مقام

اپنی مدح میں مبالغہ اور دوسروں کے فضل کے اعتراف میں تنگ دلی کا مظاہرہ عام انسانی فطرت میں داخل ہے لیکن پیغمبر اس قسم کی انسانی کمزوریوں سے ارفع ہوتا ہے اور وہ ہر بات کو اتنا ہی بیان کرتا ہے جتنی وہ حقیقت کے مطابق ہو۔ عدل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ حضور ﷺ اپنی اور

پیشرو انبیاء کی مثال دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

ان مثلی و مثل الا نبیاء من قبلی کرجل بنی بینا فاحسنه واجمله الا موضع لبنته من زاویة من نعایا ہ فجعل الناس یطوفون بهِ و یجعبون له و یقولون هلا وضعت هذه فانا تلك اللبنة و انا خاتم النبیین ۔ (رواہ الشیخان عن ابی ہریرۃ)

اس حدیث میں ایک بڑی حقیقت یہ پوشیدہ ہے کہ تکمیل دین میں بھی ارتقائی منازل طے ہوتی رہی ہیں۔ عقل انسانی کے ساتھ ساتھ دینی تصورات میں بھی ارتقاء ہوتا رہتا ہے۔ جب ایک عمارت بنتی ہے تو بنیاد کھودنے سے لے کر تکمیل عمارت تک ہر قدم ارتقائی ہی قدم ہوتا ہے۔ دین کی عمارت میں بھی یہی صورت رہی ہے۔ ہر پیغمبر نے ایک اینٹ رکھ کر اس مقصد کو آگے بڑھایا ہے اور عمارت کو تکمیل سے قریب تر کر دیا۔ لیکن تکمیل خاتم النبیین کے ہاتھوں ہوئی۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ۔ الخ

''آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنا انعام پورا کر دیا'' یہ اسلام ایک دین اور نظام زندگی کی حیثیت سے تمام انبیاء کا واحد دین تھا یعنی سب کا دین اسلام ہی تھا۔ اور سب نے اس عمارت کو پروان چڑھانے میں اپنی استطاعت بھر حصہ لیا۔ مگر تکمیل واختتام اور اس نعمت کا اتمام محمد ﷺ عربی کے ہاتھوں ہوا اور نبوت کا مقصد پورا ہو گیا۔ اسی لئے نبوت بھی ختم ہو گئی۔ گویا معمار دین تو سبھی پیغمبر ہیں لیکن آخری معمار خاتم النبیین ہیں۔ اِس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہئے کہ حضور ﷺ کی مقدار خدمت بس اتنی ہی نسبت رکھتی ہے جتنی پوری عمارت میں ایک اینٹ بہ نسبت پوری عمارت کے مقابلے میں رکھ کر نہ دیکھئے۔ الگ الگ اینٹوں کے مقابلے میں رکھ کر دیکھئے جو ایک ایک پیغمبر نے رکھی۔ یہ ساری اینٹیں الگ الگ بھی قابل قدر ہیں۔ لیکن سب مل کر بھی عمارت کی تکمیل نہیں کرتیں۔ صرف حضور ﷺ کی رکھی ہوئی آخری اور کامل اینٹ نے تکمیل عمارت کی۔ اس لحاظ سے اظہار حقیقت کی جو مثال اِس تشبیہ میں دی گئی ہے اِس سے بہتر تمثیل نہیں ہو سکتی۔

صدیقؓ وفاروقؓ کی تمثیل

جنگ بدر میں سترہ افراد قید ہو کر آئے تھے۔ان قیدیوں کے متعلق جب حضور ﷺ نے مشورہ فرمایا تو حضرت ابوبکرؓ نے رائے دی کہ فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔شاید اللہ انہیں توبہ کی توفیق دے۔حضرت عمرؓ بولے کہ ان لوگوں نے حضور ﷺ کو بے وطن کیا اور جھٹلایا ہے اس لئے سب کی گردنیں اُڑا دی جائیں۔حضور ﷺ نے فرمایا:۔

مثلك یا ابابكر كمثل ابراهیم قال :فمن تبعنی فانه منی ومن عصانی فانك غفور رحیم و كمثل عیسیٰ قال ان تعذبهم فانهم عبادك فان تغفر لهم فانك انت العزیز الحكیم ۔ومثلك یاعمر كمثل نوح ۔قال: رب لاتذر علی الارض من الكافرین دیاراً و كمثل موسیٰ ،قال: واشدد علیٰ قلوبهم فلا یومنوا حتیٰ یروا العذابُ الالیم۔ (رواہ ابوداؤد عن ابن مسعود)

اے ابوبکر! تمہاری مثال تو حضرت ابراہیمؑ اور حضرت عیسیٰؑ جیسی ہے۔حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا تھا کہ:(ترجمہ) جو میری پیروی کرے وہ میرا ہے اور جو نافرمانی کرے تو اللہ غفور ورحیم ہے اور عیسیٰؑ نے فرمایا تھا کہ :(ترجمہ) اگر تو انہیں سزا دے تو یہ تیرے بندے ہیں اور اگر ان کی مغفرت فرمائے تو عزیز وحکیم ہے۔اور اے عمر! تمہاری مثال نوحؑ اور موسیٰؑ جیسی ہے۔نوحؑ نے یہ دعا کی تھی کہ:(ترجمہ) ان کافروں میں کسی کو بھی زمین پر زندہ نہ چھوڑ۔اور موسیٰؑ نے یہ دعا کی کہ:(ترجمہ) ان کے دلوں میں اور سختی پیدا کر دے تا کہ عذاب الیم کو دیکھے بغیر یہ ایمان ہی نہ لاسکیں۔

ابوبکرؓ وعمرؓ کی سیرتوں کے ساتھ سیدنا ابراہیمؑ وعیسیٰؑ اور سیدنا نوحؑ وموسیٰؑ کی سیرتوں سے جو واقف ہوگا وہ یہ اقرار کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ان دونوں بزرگوں کے لئے اس سے بہتر تشبیہ وتمثیل ممکن نہیں ۔اس تمثیل میں ایک بڑی پاکیزہ حقیقت مستور ہے۔وہ یہ کہ دو مختلف قسم کے اعمال ہوں تو دونوں ہی حسنات ہو سکتے ہیں بشرطیکہ نیتیں درست ہوں۔

صراط مستقیم

صراط مستقیم اور اُس کے ساتھ کئی چیزوں کی تشبیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں دی ہے:

ضرب اللہ مثلا صراطاً مستقیما و عن جنبتی الصراط سوران فیھا ابواب مفتحة وعلی الابواب ستور مرخاة و عند راس الصراط داعٍ یقول استقیموا علی الصراط فلا تعرجوا وفوق ذالك داعٍ یدعوا کلما ھم عبد ان یفتح شیئاً من تلك الابواب قال ویحك لاتفتہ فانك ان فتحتبہ تلجہ۔ ثم فسرہ بان الصراط ھوالاسلام وان الابواب المفتحة محارم اللہ وان الستورا لمرخاة حدود اللہ والداعی علیٰ راس الصراط ھو القراٰن والداعی فوقہ ھو واعظ اللہ فی قلب کل مومن۔

(رواہ رزین ابن مسعود)

اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں صراط مستقیم کا جو تذکرہ فرمایا اس کی مثال یہ ہے کہ جیسے ایک سیدھا راستہ ہو جس کے دونوں طرف دیواریں ہوں اور ان میں جابجا دروازے کھلے ہوئے ہوں جن پر پردے آویزاں ہوں۔ اور سرِ راہ ایک نقیب پکار رہا ہو کہ دیکھ بھال کر چلنا اور اِدھر اُدھر نہ مڑنا۔ اس کے آگے دوسرا نقیب ہے جس کا کام یہ ہے کہ اگر کسی نے دروازہ کھولنے کے لئے ہاتھ بڑھایا اور وہ چلا اُٹھا کہ ارے بدنصیب اسے نہ کھولنا ورنہ اندر چلا جائے گا۔ پھر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تفسیر میں فرمایا۔ یہ صراط اسلام ہے۔ دروازے خدا کی طرف سے حرام کردہ اشیا اور پردے حدود اللہ۔ پہلا نقیب قرآن حکیم اور دوسرا مومن کا نفس لوامہ ہے۔

واعظِ بے عمل

اس کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت لطیف مثال دی ہے۔

مثل الذی یعلم الناس الخیر و ینسی نفسہ کمثل السراج یضی الناس و یحرق نفسہ ۔ (رواہ الطبرانی الکبیر عن جندل)

جو شخص دوسروں کو نیکی کی تعلیم دے اور خود اس پر عمل نہ کرے اس کی مثال چراغ کی سی ہے جو اوروں کو تو روشنی دے اور اپنے آپ کو جلاتا رہے۔

شیطانی وحی

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

ایک دن قبلہ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے فرمایا کہ روحانی سفر میں بڑے نازک مقام آتے ہیں۔ اگر پیچھے سنبھالنے والا کامل مرشد نہ ہو تو سالک راہِ حق سے بھٹک سکتا ہے۔ ابلیس نے کئی لوگوں کو فریب دے کر نبوت و مہدویت کے دعوے کرائے اور مخلوق خدا کو گمراہ کیا۔ میں جب بنوں میں تھا تو ایک ایم اے پاس عورت جس کا نام عطیہ تھا میری بیعت ہو گئی۔ اس کے خاوند بھی ایک مقامی کالج میں پروفیسر تھے۔ اس نے بہت اچھے طریقے سے تعلیم پر عمل شروع کر دیا اور اچھی خاصی روحانی ترقی کر لی۔ وہ دونوں میاں بیوی مجھے ملنے کیلئے اکثر و بیشتر آتے رہتے تھے۔ ایک دن میں شام کو سیر کو نکلا تو خیال آیا کہ عطیہ کافی دنوں سے نہیں آئی ذرا اس کو ملتا جاؤں۔ جب میں ان کے گھر آیا تو نوکر نے بتایا کہ بیگم صاحبہ اپنے کمرے میں عبادت کر رہی ہیں۔ میں نے پروفیسر صاحب کا پوچھا تو اس نے کہا کہ وہ بھی ان کے پاس بیٹھے ایک رجسٹر پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ میں ان کے کمرے میں چلا گیا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے ایک مصلے پر دوزانو بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ بڑے جلال سے بولی کہ آپ نے مجھے سلام کیوں نہیں کیا۔ میں نے کہا حرام زادی! تو میری مرید ہے اس لئے تجھے چاہئے تھا کہ مجھے سلام کرتی۔ اس نے بڑے رعب سے کہا کہ آپ کو معلوم نہیں میں کون ہوں؟ میں نے پوچھا کہ آپ کون ہیں تو اس نے کہا کہ ''میں تمہارا رب ہوں۔ میں عطیہ پر ایک کتاب نازل کر رہا ہوں تاکہ موجودہ دور کے لوگوں کی اصلاح کی جاسکے۔ میں آپ کی ڈیوٹی بھی لگا رہا ہوں کہ اس تعلیم کو دنیا میں پھیلائیں'' میں سمجھ گیا کہ معاملہ کیا ہے۔ میں نے اسے کہا کہ رب صاحب یہ تو بتایئے کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ایک کتاب اللہ کے آخری رسول ﷺ کے توسط سے پوری انسانیت کے لئے اتاری گئی تھی اور اس میں یہ کہا گیا تھا کہ ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا ہے اور تم پر اپنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔ تو اس کے بعد ہم کسی دوسری کتاب کو کیوں قبول کریں؟ اس پر اس نے کہا کہ ''میں جو تمہارا رب تمہیں حکم دے رہا ہوں'' پہلے تو میں

اس سے شغل کر رہا تھا لیکن یہ بات سن کر مجھے بھی غصہ آ گیا۔ میں نے اسے ماں کی گالی دیتے ہوئے کہا ''تم جیسے تین سو ساٹھ رب پھرتے ہیں حکم دینے والے۔ GETOUT '' یعنی دفعہ ہو جاؤ اس پر عطیہ صاحبہ کی روحانی لائن کٹ گئی اس نے آنکھیں کھول لیں اور سنبھل کر بیٹھ گئی۔ مجھے جو اپنے پاس دیکھا تو بڑے ادب سے سلام کیا اور پوچھا کہ آپ کب آئے؟ اس پر میں نے اسے پوچھا کہ یہ سب کیا ہو رہا تھا اور تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟ عطیہ نے کہا کہ ذکر کے بعد جب میں مراقبے میں بیٹھتی تو مجھے ایک سبز رنگ کا بہت بڑا ستارہ دکھائی دیتا ہے اور اس سے نور کی ایک شعاع نکل کر میرے دل میں پیوست ہو جاتی ہے اور مجھے ہدایات ملنی شروع ہو جاتی ہیں۔ میں بولتی جاتی اور میرے میاں ساری باتیں رجسٹر میں لکھتے جاتے ہیں میں نے اسے بتایا کہ یہ تو شیطان تھا اور تمہیں بزرگی کا جھانسہ دے کر گمراہ کر رہا تھا۔ میں نے وہ رجسٹر نذر آتش کروا دیا۔ میں نے وہ رجسٹر دیکھا تھا اس میں کوئی بات اسلام کے خلاف نہ تھی۔ بڑی اچھی اچھی باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ شیطان اللہ کی راہ پر چلنے والی ایک مخلص مومنہ کو گمراہ کرنے میں تو کامیاب ہو چلا تھا۔ کوئی دوسرا اس کو نہ بھی مارتا پھر بھی شیطان کا وار اس پر تو چل ہی گیا تھا۔ مرزا غلام احمد بھی شروع میں ٹھیک تھا۔ عیسائیوں کے خلاف مناظرے بھی خوب کرتا تھا اور اسے کشف بھی ہوتا تھا وہ بھی اسی طرح شیطان کے ہتھے چڑھ گیا لیکن اسے کوئی سنبھالنے والا نہ تھا۔ وہ اسی طرح مارا گیا۔

روحانی سیر

(محمد صدیق ڈار توحیدی)

انسانی جسم پر حکمرانی کرنے والی اور اس کے تمام اعضاء کو اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرنے والی اصل طاقت ہی انسان کی حقیقت ہے اسے روح کا نام دیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے انسان کو اپنی بندگی کے لئے پیدا کیا ہے۔ یہ بندگی نباتات' جمادات اور ملائکہ کی اطاعت سے یقیناً مختلف ہے ورنہ بندگی کو انسان کے لئے مخصوص نہ کیا جاتا۔ انسان سے جو بندگی مطلوب ہے اس سے مراد وہ والہانہ اطاعت ہے جو معرفت اور شدید محبت سے معمور ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو محبت کا جوہر عطا کر کے اس زمین پر بھیجا جہاں کا پتا پتا اور ذرہ ذرہ اس کی صفات کا مظہر بن کر اللہ کی تلاش و جستجو اور اس کے قرب و رضا کی دعوت دے رہا ہے۔ بقول اقبالؒ:

یہ دنیا دعوت دیدار ہے فرزند آدم کو
کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوق عریانی

(ارمغان حجاز)

اس عظیم سعادت کے حصول کے لئے انسان کو ظاہری حواس عطا کئے گئے تاکہ ان کے ذریعے مادی مظاہر فطرت کا مطالعہ و مشاہدہ کر کے روح اپنے رب کی معرفت حاصل کرے اور اس کی محبت میں آگے ہی آگے بڑھتی چلی جائے۔ یہ روح انسانی کا صرف ایک رخ ہے جو عقل و شعور کے توسط اور حواس خمسہ کے سبب مادی عالم سے جڑا ہوا ہے۔ اس کا ایک دوسرا رُخ بھی ہے اور اس کا تجربہ کم و بیش ہر انسان کو ہوتا ہے اور ہر روز ہوتا ہے۔ انسان جب سو جاتا ہے تو اس کا شعور عارضی طور پر معطل ہو جاتا ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اردگرد کے حالات بلکہ اپنے جسم سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس بے خبری کی کیفیت میں کئی مرتبہ عالم خواب میں آئندہ پیش آنے والے یا دور دراز مقامات پر ہونے والے واقعات اسے نظر آ جاتے ہیں حالانکہ بیداری کی حالت میں ایسا نہیں ہوتا۔ اسی طرح جاگتے میں بغیر کسی ظاہری ذریعہ علم اور شعوری کوشش کے کبھی

کبھی خیال یا تجویز اچانک ہمارے دل و دماغ میں وارد ہو جاتی ہے۔ اسے چھٹی حس یا E.S.P کا نام دیا جاتا ہے۔

ان تجربوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ روح انسانی کا تعلق کسی دوسرے عالم سے بھی ہے جہاں شعور کا عمل دخل نہیں اور ظاہری آنکھوں کے علاوہ ایک باطنی حس بھی ہے جو دیکھنے کی صلاحیت سے بہرہ ور ہے۔ خواب کے علاوہ بھی اگر کوئی انسان اس امر پر قادر ہو کہ اپنے حواس ظاہری کو اپنی قوت ارادی سے عارضی طور پر معطل کر لے یعنی مادی عالم کی نفی کر کے مراقبہ میں چلا جائے تو اس کا تعلق عالم روحانی سے قائم ہو سکتا ہے۔ نفسیات کی زبان میں یوں کہہ لیں کہ جب شعور غائب ہو جائے تو لاشعور جاگ اٹھتا ہے اور اس کا تعلق روحانی طبقات سے ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص صلوٰۃ و ذکر اور مجاہدے کے ذریعے اپنے قلب کا تزکیہ کسی حد تک کر چکا ہو تو خواب یا نیم بیداری کی کیفیت میں آئندہ ہونے والے کچھ واقعات اس کے لاشعور میں منعکس ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اس شخص کو تمام عالم روحانی کا ہر واقعہ معلوم نہیں ہو جاتا بلکہ اس کی روح کو اپنے مقام کی مناسبت سے جس قدر ماحول کا علم ہوتا ہے صرف اسی حصے میں تنزل کرنے والے واقعات معلوم ہو سکتے ہیں۔ جو لوگ روحانی سلسلوں میں بیعت ہو کر مطلوبہ صلاحیت حاصل کر لیتے ہیں ان میں سے کئی ایک کو اس طرح کے تجربات ہوتے رہتے ہیں۔ جو لوگ نفی اثبات کا ذکر صحیح طریقے سے کرتے اور پاس انفاس کے ذریعے اپنی توجہ اور دھیان اللہ کی طرف لگائے رکھتے ہیں ان کا دل بیدار ہو جاتا ہے اور ان کے قلب کی وہ آنکھ کھل جاتی ہے جو مادی دنیا کے اس پار کے عالم میں جھانک سکتی ہے۔ اس مشاہدے کو روحانی سیر کا نام دیا جاتا ہے۔

ان میں سے بعض سالکوں کو نور، روشنی یا روحانی شکلیں نظر آتی ہیں۔ خواب یا جاگتے میں روحیں نظر آنے لگتی ہیں۔ دوزخ اور جنتوں کی سیر ہوتی ہے۔ فرشتوں اور انبیاء کی زیارت ہونے لگتی ہے۔ لیکن ہر ایک کے ساتھ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان میں سے بعض تو اللہ تعالیٰ کی یاد اور محبت میں اسقدر مستغرق ہوتے ہیں کہ کسی اور چیز کو دیکھنے کی فرصت اور استعداد ہی ان میں باقی نہیں رہتی اور بعض کی آنکھوں پر اللہ تعالیٰ خود پردہ ڈال دیتا ہے ورنہ وہ ان دلفریب نظاروں کی

سیر ہی میں پھنس کر رہ جائیں۔ اس لئے جن سالکوں کو کچھ بھی نظر نہ آئے انہیں یہ خیال ہرگز نہ کرنا چاہئے کہ ہماری ترقی نہیں ہو رہی۔ انہیں یہ دیکھنا چاہئے کہ مرشد کی دی ہوئی تعلیم پر عمل کرنے سے قلب میں سوز، محبت اور اللہ کی ذات سے تعلق اور اس پر توکل بڑھ رہا ہے، دنیا کی محبت کی بجائے آخرت کی فکر دل میں بڑھ رہی ہے اور اخلاق کی اصلاح ہو رہی ہے یا نہیں۔ روحانی اثرات کا جلد یا دیر سے پیدا ہونا اور روحانی سیر کا ہونا یا نہ ہونا دراصل سالک کی ذہنی اور روحانی بناوٹ پر منحصر ہوتا ہے۔

اس لئے اس کے بارے میں تشویش لاحق نہیں ہونی چاہئے۔ سالک کو کچھ دکھائی دے یا نہ دے لیکن اللہ کے ذکر کے اثرات ضرور مرتب ہوتے ہیں۔ راہ تصوف اور ذکر کا مقصود روشنیاں اور روحانی صورتیں دیکھنا تو نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی محبت کا حصول ہے۔ لہٰذا خلوص کا تقاضا یہی ہے کہ راستے کے ان نظاروں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے آقا اور محبوب کا ذکر پورے ذوق و شوق سے جاری رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے کثرت سے ذکر کرنے والوں کے لئے قرآن کریم میں جس نعمت کا وعدہ فرمایا ہے وہ اصل دولت ہے اور ہر ایک کو عطا کی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان کیا ہے کہ دل صرف اللہ کے ذکر سے اطمینان پاتے ہیں۔ یہ بھی فرمایا کہ تم میرا ذکر کرو میں تمہارا ذکر کرونگا اور یہ بشارت بھی فرمائی کہ کثرت سے ذکر کرنے والوں کیلئے ہم نے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے یہی نعمتیں سب سے بڑی ہیں اور یہی اصل مطلوب ہیں۔ ان کے علاوہ جو کچھ ملے یا دکھائی دے تو یہ مالک کی اضافی رحمت اور سالکوں کے لئے حوصلہ افزائی کا سامان ہے۔

قارئین ''فلاح آدمیت'' کی دلچسپی کی خاطر گذشتہ چند شماروں میں ہم بانی سلسلہ توحیدیہ کے چند روحانی مشاہدات پیش کر چکے ہیں۔ اب بھی سلسلے کے کئی بھائی اس طرح کی چیزیں دیکھتے رہتے ہیں۔ چونکہ اپنے روحانی مشاہدات دوسرے بھائیوں کو بتانے کی اجازت نہیں ہوتی اس لئے وہ ان کا ذکر کسی سے نہیں کرتے۔ ایسے بھائی راہنمائی حاصل کرنے کیلئے ایسے خواب یا مشاہدات مجھے لکھ کر بھیج دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں حال ہی میں آئے ہوئے دو بھائیوں کے خط ان کے نام لکھے بغیر یہاں نقل کر رہا ہوں۔

☆ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ ''کل میں خانہ کعبہ گیا ہوا تھا۔ اللہ تعالیٰ کا گھر بہت ہی خوبصورت لگ رہا تھا۔ مجھے جانے کیا ہوا کہ بس میں اللہ سے چمٹ گیا اور مجھے بہت سکون ملا۔ لیکن ساتھ ہی ڈر بھی رہا تھا کہ انہیں کہیں کھو نہ دوں۔ اس لئے میں نے اللہ میاں کے دونوں ہاتھوں کو پکڑ لیا کہ اب کہیں نہیں جانے دوں گا اللہ کو یہ میرے ہیں۔ اس کے بعد میری آنکھ کھل گئی۔ میں نے حضور ﷺ کے روضہ مبارک کی سنہری جالیاں بھی دیکھیں مگر ان کے قریب نہ جا سکا نجانے کیوں۔ غالباً ابھی میں اس قابل نہیں ہوا۔ ایک رات پہلے ایک بزرگ خواب میں ملے۔ ان کی آنکھیں سبز تھیں لیکن ان کی ڈاڑھی نہ تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ میں جو کچھ چاہتا ہوں کیا وہ مجھے مل جائے گا۔ وہ چپ ہو گئے لیکن میں سب کچھ سمجھ گیا''

☆ دوسرے بھائی رقمطراز ہیں ''مجھ پہ کئی ماہ سے جو کیفیات وارد ہوئیں ان کو بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ ایک دفعہ روحانی پرواز کے بعد ایسے سمندر نما مقام پہ پہنچا جہاں ماسوائے سکون و راحت کے کچھ محسوس نہیں ہوا اور کافی دیر میں اس عالم میں غرق رہا۔ اس کے علاوہ بار بار روحانی پروازیں ہوئیں مگر ان میں سے کسی بھی عالم کی وضاحت کرنے سے قاصر ہوں۔ دو دن قبل نیم بیداری کی حالت میں کیا دیکھتا ہوں کہ فضا میں ایک نغمہ سا گونج رہا ہے جس کا مفہوم کچھ اس طرح تھا کہ ہم نے آپ کو جن وانس اور دیگر مخلوق پر شہنشاہی عطا کی ہے۔ اس نغمے کو میں بھی دہرانے لگا جونہی میں نے یہ الفاظ یا اس کے مماثل الفاظ دہرائے تو میں نے یکا یک حضرت سلیمانؑ کی قربت محسوس کی۔ اس کے ساتھ ہی ٹارچ کی روشنی کی مانند شعاؤں کی شدت اس قدر زیادہ تھی کہ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے دو بھاری سی میخیں میرے سینے میں گاڑھ دی گئی ہوں۔ اس کے ساتھ ہی میری پرواز راکٹ کی سپیڈ سے بلندی کی طرف شروع ہو گئی اردگرد کے تمام مقامات کی ماہیت ایک طویل پٹی کی مانند تھی جس میں ایک حصہ ہلکے سفید رنگ اور دوسرا بالکل خلاء کی طرح کا تھا۔ یہ کیفیت کافی دیر تک مجھ پر طاری رہی۔ پھر کچھ لمحے بعد بالکل یہی کیفیت دوبارہ شروع ہو گئی اس مرتبہ فرق صرف یہ تھا کہ حضرت سلیمانؑ کی بجائے حضور نبی کریم ﷺ کی روحانیت سے فیضان ملا۔ اگرچہ ان مقدس ہستیوں کی صورت وشباہت نظر نہ آئی مگر یہ یقین حاصل رہا کہ یہ فیض انہی

سے مل رہا ہے۔ یہ کیفیت اس طرح وارد ہوئی جیسے کسی مریض کو بے ہوش کئے بغیر اس کا آپریشن کیا جائے۔ ان مواقع پر غالباً حضرت ابراہیمؑ تھے جو نگرانی یا مشاہدہ فرما رہے تھے۔ تاہم مجھے اس بات کا یقین نہیں کہ وہ حضرت ابراہیمؑ تھے یا حضرت نوح علیہ السلام۔ مذکورہ بالا کیفیات مجھ پر دو مرتبہ دہرائی گئیں۔ اس کے بعد میں ایک عجیب قسم کے سمندر نما مقام تک پہنچ گیا جس میں داخل ہو کر بہت فرحت حاصل ہوئی''۔

قارئین کرام! اللہ تعالیٰ کی راہ پر چلنے والوں کو عجیب و غریب قسم کی روحانی کیفیات سے واسطہ پڑتا ہے۔ ہر سالک کا راستہ اور راستے کی سیر ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ ان نازک مقامات اور کیفیات سے سلامتی کے ساتھ گذرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل اور رحمت کی ہر قدم پر ضرورت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کے ساتھ جو خطرات وابستہ ہیں ان کی نشاندہی کے لئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنے ہادی و مرشد حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی کتاب ''تعمیر ملت'' سے متعلقہ اقتباس آپ کی خدمت میں پیش کردوں۔

''جذب کی طرح کشف القبور اور رویت ارواح میں بھی کئی بڑے خطرات ہیں ایک تو یہ کہ یہ تماشا بہت دلچسپ ہوتا ہے اور اسے چھوڑ کر آگے بڑھنے کو دل ہی نہیں چاہتا۔ دوسرے یہ کہ اکثر سالکوں کے دل میں اس کی وجہ سے کبر و غرور پیدا ہو جاتا ہے۔ تیسرے یہ کہ اکثر سالک رویت ارواح کو ہی انتہائے بزرگی اور منتہائے سلوک سمجھ لیتے ہیں۔ ان تینوں باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ ان تمام اشغال و اوراد سے دستکش ہو جاتے ہیں جو تکمیل سلوک کے لئے ضروری ہیں۔ وہ یہ سمجھ ہی نہیں سکتے کہ یہ تو سلوک کی الف بے تے ہے ابھی تو دائرہ ولایت میں پہلا قدم بھی نہیں رکھا گیا۔ ہم خود کئی ایسے طالبوں کو جانتے ہیں جو اس مقام پر ایسے پھنسے کہ پھر آگے نہ بڑھ سکے اور اپنے اعلیٰ مقصد یعنی حصول معرفت و رویت باری تعالیٰ سے محروم رہ گئے۔ اس لئے طالبان راہ حق کے فائدے کے لئے عرض کیا جاتا ہے کہ اگر یہ مشاہدات پیش آئیں تو انہیں پر پشہ کے برابر بھی وقعت نہ دو۔ اگر ہو سکے تو بالکل نفی کر دو۔ نہ ہو سکے تو نظر انداز کر کے برابر آگے بڑھتے رہو اور اس وقت تک نہ ہونے دو جب تک کہ عدم سے پار نہ ہو جاؤ کہ اصل حقائق کا پتہ عدم سے آگے ہی لگتا ہے۔''

شہادت امام حسینؓ

(ڈاکٹر خواجہ عابد نظامی)

60ء ہجری میں یزید نے تخت نشینی کا اعلان کیا تو جن بزرگ صحابہؓ نے خلافت کی اس تبدیلی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا۔ان میں نمایاں ترین نواسہ رسول حضرت سیدنا امام حسینؓ تھے، جنہوں نے رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی گود میں پرورش پائی تھی اور جن کی تربیت کرنے والوں میں بنت رسول اللہ سیدۃ النساء حضرت فاطمہؓ اور شیر خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہ جیسی عظیم ہستیاں شامل تھیں حضرت حسینؓ نے عہد رسالت اور عہد خلفائے راشدین میں اپنا بچپن اور جوانی کا زمانہ گزارا تھا۔ یہ حسینؓ اب ایک ایسے شخص کو کیونکر مسلمانوں کا امیر تسلیم کر سکتے تھے، جس کی زندگی اصحابؓ رسول اللہ سے بالکل مختلف تھی۔ یزید کے اعلان تخت نشینی سے اُنہوں نے جان لیا تھا کہ اب صدیقؓ و فاروقؓ کی صداقت وعدالت کے بجائے قیصر و کسریٰ کا ٹھاٹھ باٹھ اختیار کیا جائے گا اور آئندہ مسلمانوں کا خلیفہ آزادانہ منتخب ہونے کے بجائے زبردستی مسلمانوں پر مسلط کیا جائے گا۔

یزید نے اقتدار سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ مدینہ کے گورنر ولید بن عقبہ کو ایک فرمان بھیجا کہ وہ امام حسینؓ اور عبداللہ بن زبیرؓ سے فوراً بیعت لے۔ولید نے دونوں بزرگوں کو دربار میں بلایا لیکن حضرت امام حسینؓ نے فرمایا کہ میں اس طرح چھپ کر بیعت نہیں کر سکتا، بیعت کیلئے اہل مدینہ کو بلاؤ ان سب کے ساتھ میں بھی آجاؤں گا۔ یہ کہہ کر آپ واپس آگئے ۔ادھر عبداللہ بن زبیرؓ نے غور کرنے کیلئے کچھ وقت مانگا، اور پھر مکہ مکرمہ میں جا کر پناہ گزین ہو گئے۔

بیعت کیلئے ولید کا دباؤ روز بروز بڑھ رہا تھا، ان حالات میں حضرت امام حسینؓ اپنے اہل و عیال کو لیکر مکہ کی طرف روانہ ہو گئے ۔مکہ میں آپ نے شعب ابی طالب میں قیام فرمایا۔ یہاں آپ کے نام اہل عراق کے خطوط کا تانتا بندھ گیا۔ ہر خط میں یہ لکھا ہوتا کہ آپ فوراً کوفہ تشریف لائیں، ہم سب آپ کے دست مبارک پر بیعت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ان لوگوں کے پیہم اصرار پر

آپ نے اپنے چچا زاد بھائی مسلم ابن عقیلؓ کو کوفہ روانہ کیا تاکہ وہ حالات کی اچھی طرح تحقیق کریں۔ حضرت مسلمؓ کوفہ میں پہنچے تو ان کی قیام گاہ پر مقامی لوگوں کی آمد و رفت شروع ہو گئی۔ ان سب کا یہی اصرار تھا کہ حضرت امام حسینؓ جلد کوفہ تشریف لائیں ہم سب ان کی بیعت کرنے کیلئے تیار ہیں۔ کیونکہ یزید جیسا فاسق شخص اس لائق نہیں ہے کہ وہ امت مسلمہ کی قیادت و امامت کا فریضہ انجام دے سکے۔ ان حالات کی اطلاع جب جاسوسوں کے ذریعے یزید تک پہنچی تو اس نے فوراً بصرہ کے گورنر ابن زیاد کو حکم بھیجا کہ وہ کوفہ جا کر مسلم ابن عقیلؓ کو ان کی باغیانہ سرگرمیوں سے روکے اگر وہ باز نہ آئیں تو انہیں قتل کر دیا جائے۔ یہ حکم ملتے ہی ابن زیاد آندھی کی طرح کوفہ پہنچا اور اہل کوفہ کو اکٹھا کر کے کہا: ''امیر المومنین نے مجھے تم پر حاکم مقرر کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ میں اطاعت گزار لوگوں کے ساتھ حسن سلوک اور نافرمانوں کے ساتھ انتہائی سختی کے ساتھ پیش آؤں۔ اب میں اس حکم کو پورا کر کے رہوں گا۔'' (ابن اثیر ج 4 ص ۱)

اس تقریر کے بعد ابن زیاد نے پہلا کام یہ کیا کہ ہر محلہ میں ایک شخص کو سرکاری چودھری مقرر کر دیا اور اسے علاقہ کے ہر کام کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ نیز اس نے حکم دیا کہ وہ اپنے محلہ کے ایسے افراد کی فہرستیں بنا کر پیش کریں، جو حکومت وقت کے خلاف ہوں اور حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں مصروف رہتے ہوں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ دھمکی بھی دی کہ جو چودھری اس حکم کی تعمیل میں کوتاہی کرے گا اسے اس کے دروازے ہی پر پھانسی پر لٹکا دیا جائیگا۔

ان سخت انتظامات و احکامات کے باعث مسلم بن عقیلؓ احتیاط کے پیش نظر مختار کے گھر سے نکلے اور ایک دوسرے محب اہل بیت ''ہانی بن عروہ'' کے گھر منتقل ہو گئے۔ ہانی کو پہلے تو حضرت مسلمؓ کو ٹھہرانے میں ذرا تامل ہوا، لیکن مروت کے باعث مان گئے۔ یہاں بھی محبان اہل بیت کی خفیہ آمد و رفت کا سلسلہ جاری رہا اور تقریباً اٹھارہ ہزار کوفیوں نے حضرت مسلمؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ یہ حالات دیکھ کر حضرت مسلمؓ نے حضرت امام حسینؓ کو لکھ بھیجا کہ حالات موافق ہیں، آپ فوراً کوفہ میں آجائیں۔

ہانی کی گرفتاری

ابن زیاد ہر لحہ حضرت مسلمؓ کی تلاش میں تھا، لیکن جاسوسی کے زبردست نظام کے باوجود اسے ان کے ٹھکانے کا پتہ معلوم نہ ہوتا تھا۔ آخر اس کے ایک غلام معقل نے حضرت مسلمؓ کے وفادار رضا کار کا بھیس بدل کر ان کا ٹھکانہ معلوم کرلیا۔ ہانی کوفہ کے بڑے سرداروں میں سے تھے ،ابن زیاد نے انہیں دربار میں بلایا اور پوچھا:

تم نے مسلم بن عقیلؓ کو چھپایا ہے؟

وہ ابھی خاموش تھے کہ معقل نامی ایک شخص نے کھڑے ہو کر شہادت دی کہ مسلم بن عقیلؓ ان کے گھر میں پناہ گزین ہیں۔ یہ سن کر ابن زیاد نے موقع ہی پر انہیں پٹوایا، اور پھر قید کر دیا۔

یہ خبر سن کر حضرت مسلم بن عقیلؓ اپنے اٹھارہ ہزار عقیدت مندوں کو لیکر ہانی کے گھر سے نکلے اور ابن زیاد کے محل کو گھیر لیا۔ اتفاق سے اس وقت ابن زیاد کے ہاں کوفہ کے کئی سرکاری نامزد چوہدری موجود تھے ابن زیاد نے چودھری کو حکم دیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو وہ اس وقت اپنے اپنے محلے کے لوگوں واپس بھیجیں اس کے ساتھ ہی اس نے امن وامان قائم رکھنے والوں اور حکومت کا ساتھ دینے والوں کیلئے انعام کا بھی اعلان کیا۔ اس ترکیب سے کئی لوگ حضرت مسلمؓ کا ساتھ چھوڑ کر اپنے گھروں کو واپس چلے گئے۔ اب حضرت مسلمؓ نے اپنے ہمراہیوں کو گنا تو وہ تعداد میں صرف تیس تھے۔ یہ حالات دیکھ کر حضرت مسلمؓ ایک دوسری جگہ پناہ گزین ہو گئے، لیکن ابن زیاد نے اپنے جاسوسوں کی مدد سے انہیں وہاں سے گرفتار کر کے شہید کرا دیا۔

مکہ سے امام حسینؓ کی روانگی

ادھر حضرت امامؓ کو مسلم بن عقیلؓ خط مل چکا تھا، وہ مکہ سے کوفہ جانے کیلئے روانہ ہو گئے، لیکن راستہ میں ثعلبہ کے مقام پر انہیں حضرت مسلم بن عقیلؓ کی شہادت کی خبر ملی۔ تاہم آپ نے اپنا سفر جاری رکھا، کچھ دور جا کر آپ کو کوفہ کے تفصیلی حالات معلوم ہوئے تو آپ نے اپنے ہمراہیوں کو جمع کیا اور انہیں حضرت مسلم بن عقیلؓ اور ہانی بن عروہؓ کی شہادت کی خبر سنائی بتایا کہ اہل کوفہ نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا ہے، اس لئے اب آپ لوگوں میں سے جو کوئی واپس جانا چاہتا ہے، وہ خوشی سے جا سکتا ہے، یہ سن کر کافی لوگ مجمع سے نکل کر چلے گئے اور صرف وہی لوگ آپؓ کے ساتھ رہ

گئے جو مدینہ منورہ سے ساتھ آئے تھے۔

حضرت امامؓ قادسیہ سے آگے بڑھے، تو ابن زیاد کے عامل حسین بن نمیر تمیمی کی طرف سے حُر بن یزید ایک ہزار فوج کے ساتھ نمودار ہوا، وہ ہر وقت سائے کی طرح آپ کے ساتھ رہنے لگا اسے یہی حکم تھا کہ وہ حضرت حسینؓ کے ساتھ ساتھ رہے، اور ان کی سرگرمیوں سے مطلع کرتا رہے، حتیٰ کہ وہ کوفہ میں ابن زیاد کے پاس پہنچ جائیں۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر حضرت امامؓ نے اپنے ہمراہیوں اور حُر کے ساتھیوں کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا: لوگو! تم جانتے ہو، کہ میں خود یہاں نہیں آیا۔ میرے پاس تمہارے بے شمار خطوط پہنچے، بے شمار قاصد آئے کہ ہمارا کوئی امام نہیں۔ آپ آئیں تا کہ اللہ تعالیٰ ہمیں آپ کے ہاتھ پر جمع کر دے۔ اگر اب بھی تمہاری یہی خواہش ہے تو میں آ گیا ہوں، اگر تم میری آمد سے خوش نہیں ہو تو میں واپس جانے کیلئے تیار ہوں۔"

یہ سن کر حُر بن یزید نے کہا: آپ کن خطوط کا ذکر کر رہے ہیں؟

یہ سن کر حضرت امامؓ نے خطوط سے بھرے تمام تھیلے اس کے سامنے الٹ دیئے اور فرمایا: یہ ہیں اہل کوفہ کے وہ خطوط جو مجھے بلانے کیلئے لکھے گئے۔ حُر نے کہا: مجھے تو ان خطوط کا کچھ علم نہیں، مجھے تو صرف یہ حکم ملا ہے کہ آپ کو گھیرے میں رکھوں اور ابن زیاد کے پاس پہنچا دوں۔

یہ سن کر حضرت امامؓ نے فرمایا: ایسا تو میری موت سے پہلے ممکن نہیں۔

مقام بیصہ پر پہنچ کر آپؓ نے پھر ایک خطبہ ارشاد فرمایا:

"اے لوگو! نبی رحمت اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو کوئی ایسے حاکم کو دیکھے، جو ظلم کرنے والا ہے، اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدیں توڑتا ہے۔ عہد الٰہی کو توڑتا ہے، اور دیکھنے والا اپنے قول و فعل سے اس کی مخالفت نہیں کرتا، تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ آخرت میں اچھا ٹھکانا نہیں عطا فرمائے گا۔۔۔۔ دیکھو، لوگ شیطان کے پیروکار بن گئے ہیں، رحمٰن سے سرکش ہو گئے ہیں۔ ہر طرف فساد ہے حدود الٰہی معطل ہے۔ مال غنیمت پر ناجائز قبضہ ہے۔ خدا کے حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھہرا دیا جا رہا ہے۔ ان حالات میں، میں ان لوگوں کی سرکشی کو حق و عدل سے بدل

دینے کا سب سے زیادہ حق دار ہوں۔"

مقام "قصر بنی مقاتل" پر پہنچ کر کچھ دیر کیلئے آپ کی آنکھ لگ گئی، آنکھ کھلی، تو زبان پر یہ کلمات جاری تھے: انا للہ وانا الیہ راجعون۔ الحمدللہ رب العالمین۔ آپؓ کے صاحبزادے حضرت علی اکبرؓ نے وجہ دریافت کی، تو فرمایا: میں ابھی اونگھ گیا تھا۔ خواب میں دیکھا کہ ایک سوار یہ کہتا ہوا جا رہا ہے کہ لوگ چلتے ہیں اور موت ان کے ساتھ چلتی ہے۔ حضرت علی اکبرؓ نے پوچھا: بابا جان! کیا ہم حق پر ہیں؟ بے شک ہم حق پر ہیں۔ یہ سن کر حضرت علی اکبرؓ نے کہا: اگر ہم حق پر ہیں، تو پھر موت کی کوئی پرواہ نہیں۔

ابن زیاد کا تازہ حکم

اگلی صبح آپؓ نماز سے فارغ ہوئے، تو کوفہ کی طرف سے ایک سوار آتا دکھائی دیا، قریب آیا، تو اس نے امام حسینؓ کی طرف سے منہ پھیر لیا، اور حُرؓ کو سلام کیا۔ پھر ایک خط نکال کر حُرؓ کو پیش کیا، جس میں لکھا تھا کہ حسینؓ بن علیؓ کو کہیں ٹکنے نہ دو۔ کھلے میدان کے علاوہ وہ کسی جگہ قیام کرنے نہ پائیں۔ نیز وہ کسی سرسبز وشاداب مقام یا قلعہ بند جگہ پر پڑاؤ نہ ڈالیں۔

حُر نے خط کا یہ مضمون حضرت امامؓ کو سنا دیا، اور کہا: اب میں مجبور ہوں، اب آپؓ کو کسی بے آب و گیاں میدان ہی میں اترنا ہوگا۔ آخر آپؓ 72 نفوس قدسیہ کے ساتھ ایک اجاڑ اور ویران سرزمین میں اتر پڑے۔ پوچھا اس مقام کا کیا نام ہے؟ ساتھیوں نے عرض کیا: اس کا نام کربلا ہے یہ واقعہ 2 محرم 61 ہجری کا ہے۔

دوسرے روز عمر بن سعد کوفہ سے چار ہزار فوج لیکر آپہنچا۔ اس نے امام حسینؓ کو ابن زیاد کا پیغام پہنچایا کہ وہ یزید کی بیعت کریں۔ حضرت امام حسینؓ نے فرمایا: میں پہلے بھی کہہ چکا ہوں، اور اب بھی میرا جواب یہی ہے کہ گنہگار اور غیر مستحق کی بیعت جائز نہیں۔ سات روز تک بیعت کیلئے اصرار اور انکار کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نویں محرم کو عصر کے وقت شمر ذی الجوشن کے ذریعے عمر بن سعد کو ابن زیاد کا یہ تاکیدی حکم آیا کہ دریائے [illegible] ان کا پہرہ خوب مضبوط کر دیا جائے، تاکہ حسینؓ اور اس کے ساتھی پانی حاصل نہ کر سکیں۔

صبر کی تلقین

حضرت امام زین العابدینؓ فرماتے ہیں: جس رات اگلی صبح میدان کرب و بلا گرم ہونے والا تھا، اسی شب کا واقعہ ہے کہ میں بیمار تھا۔ میری پھوپھی زینب میری تیمارداری میں مشغول تھیں اتنے میں حضرت حسینؓ داخل ہوئے۔ اس وقت وہ چند اشعار پڑھ رہے تھے، جنہیں سن کر میں سمجھ گیا کہ ان کا ارادہ کیا ہے۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو گئے اور مجھے یقین ہو گیا کہ ہم پر ابتلائے الٰہی نازل ہو گئی ہے۔''

دسویں محرم کا سورج طلوع ہوا تو حضرت امام حسینؓ نے کوفی فوج کے سامنے آخری تقریر کی، اور فرمایا:

اے لوگو! حق کے معاملے میں ہم بادشاہ وقت سے بھی نہیں ڈرتے، جس راستے پر ہم چلتے ہیں، اس پر چلنے والے لوگ ہی بہترین لوگ ہیں اور اس کی مخالفت کرنے والے قیامت کے روز خسارے میں رہیں گے۔''

حُر بن یزید پہلے بھی آپ کے خطبات سن چکا تھا۔ اس تقریر کو سن کر وہ اس قدر متاثر ہوا کہ کوفیوں کی صف سے نکل کر اعلان کیا کہ اب وہ حضرت امام حسینؓ کی طرف سے لڑے گا۔ چنانچہ وہ بڑی بہادری اور پامردی سے کوفیوں کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ لڑائی شروع تھی۔ نماز جمعہ کا وقت ہوا تو حضرت امامؓ نے بلند آواز سے پکار کو کہا: ''اب نماز کیلئے لڑائی روک دو۔'' لیکن کوفیوں پر اس بات کا کوئی اثر نہ ہوا۔ یہ دیکھ کر آپ نے اپنے ساتھیوں کے ساتھ نماز خوف کے طریقے سے نماز ادا کی۔ حضرت امامؓ کے تمام ساتھی بڑی بہادری سے لڑ کر شہید ہوئے۔ ہر ساتھی کی شہادت پر آپؓ انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھتے۔ آپ کے جوان بیٹے علی اکبرؓ شہید ہوئے تو آپ نے فرمایا: الحمد للہ! میرے بیٹے نے دین اسلام کی آبرو بڑھانے کیلئے اپنا فرض پورا کر دیا۔

یہ شکل وصورت میں میرے نانا جان سے بڑے مشابہ تھا۔

جب کوئی ساتھی باقی نہ رہا تو حضرت امامؓ خیمہ میں آئے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا عمامہ سر پر رکھا

اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی ''ذوالفقار'' تھامے میدان میں نکلے۔ یزیدی فوج پر ایک نظر ڈالی۔ دیکھا کہ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں، جنہوں نے آپ کو بلانے کیلئے کوفہ سے خطوط لکھے تھے۔

سب سے پہلے عمرو بن سعد آپ سے مقابلے کیلئے آگے بڑھا۔ آپ نے فرمایا: میرے سامنے سے ہٹ جاؤ یہ سن کر عمرو کانپنے لگا، اور خوف کے باعث پیچھے ہٹ گیا۔ یہ دیکھ کر شمر نے پیدل فوج کو اشارہ کیا۔ وہ چاروں طرف سے حضرت امامؓ پر ٹوٹ پڑی۔ یہاں تک کہ آپ کو پینتالیس زخم تلواروں اور برچھیوں کے لگے اور پینتیس زخم تیروں کے لگے۔ پھر بھی آپ نہایت بہادری سے تلوار چلاتے رہے۔ آخر ذرعا بن شریک نے آپ کے بائیں ہاتھ پر تلوار ماری۔ جس سے آپ کا ہاتھ کٹ کر گر پڑا، پھر سنان ابن انس نے سینہ پر نیزہ مارا، جو پشت سے پار نکل گیا۔ آپ زمین پر گر پڑے۔ خولی ابن زید نے سینے پر چڑھ کر سر کاٹ لیا۔

اناللہ وانا الیہ راجعون

دنیا ابن رسول اللہ ﷺ کے وجود مسعود سے خالی ہوگئی۔ حسینؓ شہید ہوگئے، لیکن اپنی جان دے کر مسلمانوں کو یہ پیغام دے گئے کہ اے مسلمانو! رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جب تم کسی ایسے حاکم کو دیکھو، جو ظلم کرتا ہے، اللہ کی قائم کی ہوئی حدیں توڑتا ہے، عہد الٰہی شکست کرتا ہے، تو اس میرے اسوہ کو یاد رکھنا کہ یہ زمین انسانوں پر ظلم کرنے کیلئے نہیں بلکہ اللہ کے احکام کے مطابق عدل وانصاف کے نفاذ کیلئے ہے۔

خدا موجود ہے

(عبدالرشید ساہی)

شعر نمبرا۔

افلاک سے آتا ہے نالوں کا جواب آخر
کرتے ہیں خطاب آخر، اٹھتے ہیں حجاب آخر

اس شعر میں اقبال نے سالکانِ راہ خدا کو یہ خوشخبری سنائی ہے کہ اگر ابتداء میں کچھ دشواریاں لاحق ہوں یا مراقبہ اور ریاضت کا کوئی نتیجہ ظاہر نہ ہو یا نزول فیضان سماوی نہ ہو تو ہرگز مایوس نہیں ہونا چاہئے یہ اللہ کی سنت ہے کہ وہ ان لوگوں پر ضرور اپنا فضل وکرم نازل کرتا ہے جو اس کے حصول کیلئے جدوجہد کرتے ہیں انجام کار نالوں کا جواب بھی آتا ہے اور حجابات بھی اٹھ جاتے ہیں یعنی سالک اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جاتا ہے

اللہ رب العزت نے قرآن مجید میں ارشاد فرمایا ہے

ترجمہ: جو لوگ ہم سے ملنے کیلئے کوشش کرتے ہیں ہم یقیناً ان کو اپنے ملنے کے رستے دکھا دیتے ہیں

مقام شوق تیرے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہی کا کام ہے یہ جن کے حوصلے بلند ہیں زیاد

دراصل عظیم تر مقام کو پانے کے لئے عظیم تر جدوجہد بھی کرنی پڑتی ہے جتنی بڑی رکاوٹیں کوئی انسان عبور کرتا ہے اتنے بڑے مقام کو حاصل کر لیتا ہے حضرت ابراہیمؑ آسانی سے خلیل اللہ کے مقام پر نہیں پہنچ پائے بلکہ جن آزمائشوں سے گزار کر ان کو یہ مقام ملا عام انسان تو اس کا تصور کر کے ہی کانپ اٹھتا ہے نبی کریم ﷺ کی زندگی ہمارے لئے مشعل راہ ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں واضح فرمادیا کہ ”آپ ﷺ فرمادیں اگر تم میں سے کسی کو اللہ کی محبت درکار ہے تو وہ آپ ﷺ کا اتباع کرے اللہ اس کو اپنا محبوب بنالے گا“ آپ ﷺ کے اتباع میں گالیاں سن کر

دعائیں دینی پڑتی ہیں۔ جس ایثار و قربانی اور رحم و کرم کا مظاہرہ آپ ﷺ نے فتح مکہ کے موقعہ پر دیا اس کی مثال زمانہ پیش کرنے سے قاصر ہے۔ رحمت عالم ﷺ نے عفوو درگزر کا وہ مظاہرہ کیا جس نے پتھر دل صحرا نشینوں کے دلوں کو موم کر دیا اخلاق کی حرارت نے آہنی انسانوں کو پگھلا کے رکھ دیا:۔

ملا جو موقعہ تو روک دونگا جلال روز حساب تیرا
پڑھونگا رحمت کا وہ قصیدہ کہ ہنس پڑے گا عتاب تیرا

اللہ کی رحمت اس کے غضب پر غالب ہے رب رحیم کی رحمت کے طالب آپ کی رحمت سے ضرور مستفیض ہوتے ہیں خالق اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے۔ لیکن قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ مٹی سے پرندے بنا کر اللہ کے اذن سے پھونک مارتے تو وہ اڑنے لگ جاتے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے رحیم اور کریم صفات ہیں مگر اللہ تعالیٰ نے یہ صفات اپنے محبوب رسول حضرت محمد ﷺ کو عطا فرمائیں اور ان صفات کے استعمال کی بدولت عرب کے بدو اونٹوں کے گلہ بانوں سے زمانے کے امام بن گئے۔

ہجوم کیوں ہے زیادہ شراب خانوں میں
فقط یہ بات کہ پیر مغاں ہے مردِ خلیق

شعر نمبر ۲۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل، طاؤس و رباب آخر

علامہ اقبال نے صرف ایک شعر میں قوموں کی زندگی کا نقشہ کھینچ کے رکھ دیا ہے ہر قوم کو حکومت جفاکشی سے حاصل ہوتی ہے حکومت سے دولت، دولت سے عیش و عشرت اور پھر عیش سے زوال ہو جاتا ہے جو قومیں دنیا کے نقشہ پر فاتح کے طور پر سامنے آئی ہیں ان کی جدوجہد کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جفاکشی اور (strugle) کے انتہا مقام پر پہنچ کر قدرت کاملہ فتح و نصرت سے کامیاب و کامران کر دیا کرتی ہے قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے ''ہر کسی کو

وہی عطا کیا جاتا ہے جس کے لئے وہ کاوش کرتا ہے'' تاریخ شاہد ہے کہ مسلمان قوم نے ایک طویل عرصہ تک دنیا میں بطور فاتح دھاک بٹھا رکھی لیکن جب حکمرانوں اور عوام نے کاہلی اور سستی کا دامن پکڑ لیا جفاکشی ترک کر کے عیاشی اور فحاشی کو اپنا لیا اس وقت سے مسلمان زیر عتاب چلے آرہے ہیں علامہ فرماتے ہیں

نگاہ عشق دل زندہ کی تلاش میں ہے
شکار مردہ سزا وار شہباز نہیں

اللہ رب العزت زندہ قوموں کی دستگیری فرماتے ہیں ساری کامیابیاں، کامرانیاں اور فتوحات ان کے مقدر میں لکھ دیتے ہیں تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوا کہ چنگیز خاں جب بغداد شہر کی آبادی کو گاجر مولی کی طرح کاٹ رہا تھا اس وقت بھی ہمارے دینی رہنما اور علماء نور بشر کے مسئلے پر مناظرے اور بحث مباحثے کر رہے تھے بڑے افسوس کی بات ہے کہ مسلمان اس نصاب کی تیاری ہی نہیں کر رہے جس کا امتحان ہونا ہے لیکن out of نصاب بڑی تیاری کرتے ہیں اللہ تعالیٰ نے تو انسان سے صرف سوال کرنا ہے کہ آپ کو اتنا Period of life دیا گیا تم نے اس وقت کا استعمال کیسے کیا فرمان ربانی ہے **''ان الدین عنداللہ الاسلام''** اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ دین صرف اسلام ہے یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک کامیاب و کامران انسان وہی ہوگا جو کہ طریقہ زندگی اسلام کے مطابق اپنائے گا اسلام ان حدود و قیود کا نام ہے جو اللہ اور رسول اللہؐ نے مقرر فرمائی ہیں اسلام ایک فطری دین ہے اس کا ہر ہر قانون انسان کی بہتری بھلائی اور فلاح کا علمبردار ہے علامہ فرماتے ہیں

کھولی ہیں شوق دید نے آنکھیں تیری اگر
ہر رہگذر پہ نقش کف پائے یار دیکھ

دامن اسلام کے ساتھ وابستگی میں انسانی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے فرمان قرآن سنیں

لاتجعلو دُعا الرسول بینکم کدعاء بعضکم بعضاً

ترجمہ: تم لوگ رسول ﷺ کے بلانے کو ایسا معمولی بلانا مت سمجھو جیسا تم میں ایک دوسرے کو

بڑا لیتا ہے ''امت مسلمہ موجودہ دور میں اضطراب کا شکار ہے اور اس سے نکلنے کا صرف ایک ہی رستہ ہے وہ ہے دامن اسلام سے مکمل وابستگی۔ میرے ایک انتہائی قریبی عزیز محمد عاصم ساہی صاحب حال ہی میں کینیڈا سے ہو کر آئے ہیں وہ بتا رہے تھے کہ وہاں فی کس آمدنی بہت زیادہ ہے انسان کو ہر طرح کی آسائشیں میسر ہیں خدائی نعمتوں کی بہتات ہے ملک بھی بڑا حسین وجمیل ہے لیکن حیرانگی کی بات ہے کہ وہاں انسانوں کو قلبی سکون میسر نہیں ہے سب کچھ میسر ہونے کے باوجود ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کچھ بھی میسر نہیں ہر طرف پریشانی ہے اور بے چینی کی فضا نظر آتی ہے میں نے اس کے جواب میں صرف اتنا بتایا۔

ترجمہ: ''بے شک دلوں کا سکون اللہ کی یاد میں ہے'' علامہ اقبال فرماتے ہیں''

دل کی آزادی شہنشاہی شکم سامان موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

دل تو اس وقت آزاد ہوگا جس وقت اس کے اندر سے رنج وملال نکل جائیں گے اور اللہ پر توکل قائم ہو جائے گا اور دل کو ان آلائشوں سے پاک کرنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے کہ اس کو اللہ کے دھیان میں لگا دیا جائے حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے اس کا یہ طریقہ بتایا ہے کہ سانسوں کے ساتھ اللہ کی یاد کو سجا لو یعنی جو سانس باہر جائے وہ بھی لفظ اللہ تصور میں کہے اور جو سانس اندر آئے وہ بھی بغیر آواز نکالے اللہ کہے لیکن میں نے خود محسوس کیا ہے کہ یہ بتانے سے نہیں بلکہ کسی مرد قلندر کی نگاہ کے فیض سے جاری وساری ہوتا ہے علامہ بھی یہی فرماتے ہیں

یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی
سکھائے کس نے اسماعیلؑ کو آداب فرزندی

اللہ ذات کبریا کا ذاتی نام ہے باقی سارے نام صفاتی ہیں اور ذاتی نام میں تمام صفات کا پرتو موجود ہے اس لئے اسم ذات کا ذکر کرنے سے انسان خدائی صفات کا حامل ہو جاتا ہے ہر شخص کی زندگی روح کے تابع ہے اور روح ازل سے اللہ کو دیکھ چکی ہے اس لئے جب بندہ اسم ذات کی تکرار کرتا ہے تو بندہ اپنی روح سے واقف ہو جاتا ہے اور وہ اس دنیا میں اللہ کو دیکھ لیتا ہے۔ میاں

محمد صاحب کھڑی شریف والے فرماتے ہیں

اول حمد ثنا الٰہی جو مالک ہر ہر دا
اس دا نام چتارن والا کسے میدان نہیں ہر دا

شعر نمبر 3۔

میخانہ یورپ کے دستور نرالے ہیں
لاتے ہیں سرور اول دیتے ہیں شراب آخر

یہ شعر اقبال کے اسلوب بیان کا بہترین نمونہ ہے مطلب یہ ہے کہ یورپ کی قومیں جب کسی ایشیائی ملک کو غلام بناتی ہیں تو پہلے دوستی کا ہاتھ بڑھاتی ہے اور اپنے ملک کی مصنوعات مثلاً سگریٹ، سگار، پوڈر، ریشمی لباس، شیشہ وآلات، موٹر کاریں، ہوائی جہاز غرض کہ زندگی کی تمام ضروریات نہایت ارزاں قیمت پر مہیا کرتی ہیں اس کے بعد پانچ سالہ اقتصادی ترقی کا پروگرام پیش کرتی ہیں اس ملک میں پل بناتی ہیں ریلوے کا جال بچھاتی ہیں تیل کے چشمے دریافت کرتی ہیں اس کے بعد ہوٹل اور کلب قائم کر کے اس میں عورت اور شراب فراہم کرتی ہیں یعنی اپنی ثقافت اور تہذیب اس ملک کے اندر داخل کرتی ہیں اور پھر اس ملک کی انڈسٹری کو مفلوج کر کے اقتصادی طور پر اس ملک کو اپنا غلام بنالیتی ہیں جیسے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے کارنامہ انجام دیا پہلے ہندوستان میں تجارت کے بہانے سے قدم جمالئے اور آہستہ آہستہ سارے ملک کا انتظام خود سنبھال لیا اور ہندوستان کو اپنا غلام بنالیا اور اب یورپین یونین تمام اسلامی ممالک میں اپنے ہتھکنڈوں کی بدولت In direct حکومت کر رہی ہیں پورے طور سے دیکھا جائے تو تمام اسلامی ممالک میں فرنگی تہذیب کا دور دورہ ہے اور جو کسر رہ گئی ہے اس کو انڈیا نے پورا کر دیا ہے اسلامی ممالک میں فحاشی اور عریانی کا طوفان بے بہا آیا ہوا ہے اور مسلمان قوم اس تہذیب کے پیچھے اندھا دھند دوڑ رہی ہے اگر یہی صورت حال رہی تو اسلامی ثقافت کا نام ونشان مٹ جائے گا علامہ فرماتے ہیں

وہ فریب خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں
اسے کیا خبر کے کیا ہے راہ و رسمِ شہبازی

اللہ تعالیٰ مسلمان حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لینے کی توفیق عطا فرمائے اور ان عاقبت نااندیشوں کو اسلامی فہم و فراست عطا کرے تا کہ یہ فرنگی تہذیب کے سامنے اللہ کے قرآن پیارے پیغمبر ﷺ کے فرمان کے مطابق بند باندھ سکیں اور مسلم اُمہ اس بے حیائی، فحاشی، عریانی اور فریب زدہ تہذیب سے بچ جائے آمین

اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے نام میرا واضح پیغام ہے کہ وہ یہود و ہنود کی مکارانہ پالیسیوں پر عمل درآمد نہ ہونے دیں اور پوری قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے تا کہ بروقت اس طوفان بے حیائی کا تدارک ہو سکے آج وقت کی اہم ضرورت ہے کہ امت محمدیہ ﷺ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہو جائے اور افغانستان، عراق اور فلسطین کے انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے آئندہ کی حکمت عملی مرتب کی جائے بے حیا امریکہ کی عملداری سے اپنی سرزمین کو بچایا جائے اور اپنے اپنے خطہ کی خود مختاری ہر صورت بحال کی جائے ایک اسلامی مملکت پر فرنگی حملہ کو تمام عالم اسلام پر حمل تصور کیا جائے اور ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا جائے کوئی بھی اسلامی ملک امریکہ یا برطانیہ کو اپنی سرزمین پر فوجی چھاؤنیاں اور ہوائی اڈے فراہم نہ کرے۔ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ قرآن جیسا نظام کسی اور کے پاس نہیں صرف مسلمانوں کے پاس ہے مگر اس نظام پر عمل درآمد نہ کر کے ہم خود ہی خوار اور تباہ ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں حق بات برملا کہنے کی قوت عطا فرمائیں۔ حق و صداقت کا ساتھ دینے کی طاقت بخشے اور حق والوں کا ساتھ نصیب فرمائے۔ زندگی تو فانی ہے ایک نہ ایک روز ختم ہو جائے گی آخری الفاظ علامہ اقبال کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اللہ رب العزت مسلمانوں کو اسلامی شعائر کی پاسداری کی توفیق عطا فرمائیں آمین

اللہ تعالیٰ مسلمان حکمرانوں کو ہوش کے ناخن لینے کی توفیق عطا فرمائے اور ان عاقبت نااندیشوں کو اسلامی فہم وفراست عطا کرے تاکہ یہ فرنگی تہذیب کے سامنے اللہ کے قرآن پیارے پیغمبر ﷺ کے فرمان کے مطابق بند باندھ سکیں اور مسلم اُمہ اس بے حیائی، فحاشی، عریانی اور فریب زدہ تہذیب سے بچ جائے آمین

اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے نام میرا واضح پیغام ہے کہ وہ یہود وہنود کی مکارانہ پالیسیوں پر عمل درآمد نہ ہونے دیں اور پوری قوت کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا جائے تاکہ بروقت اس طوفان بے حیائی کا تدارک ہو سکے آج وقت کی اہم ضرورت ہے کہ امت محمد یہ ﷺ ایک پلیٹ فارم پر اکٹھی ہو جائے اور افغانستان، عراق اور فلسطین کے انجام کو مدنظر رکھتے ہوئے آئندہ کی حکمت عملی مرتب کی جائے بے حیا امریکہ کی عملداری سے اپنی سرزمین کو بچایا جائے اور اپنے اپنے خطہ کی خود مختاری ہر صورت بحال کی جائے ایک اسلامی مملکت پر فرنگی حملہ کو تمام عالم اسلام پر حملہ تصور کیا جائے اور ڈٹ کر اس کا مقابلہ کیا جائے کوئی بھی اسلامی ملک امریکہ یا برطانیہ کو اپنی سرزمین پر فوجی چھاؤنیاں اور ہوائی اڈے فراہم نہ کرے۔ بڑے دُکھ کی بات ہے کہ قرآن جیسا نظام کسی اور کے پاس نہیں صرف مسلمانوں کے پاس ہے مگر اس نظام پر عمل درآمد نہ کر کے ہم خود ہی خوار اور تباہ ہو رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ہمیں حق بات برملا کہنے کی قوت عطا فرمائیں۔ حق وصداقت کا ساتھ دینے کی طاقت بخشے اور حق والوں کا ساتھ نصیب فرمائے۔ زندگی تو فانی ہے ایک نہ ایک روز ختم ہو جائے گی آخری الفاظ علامہ اقبال کے اس شعر پر ختم کرتا ہوں۔

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال
کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

اللہ رب العزت مسلمانوں کو اسلامی شعائر کی پاسداری کی توفیق عطا فرمائیں آمین

عہد نبوی ﷺ میں نظام حکمرانی

(ڈاکٹر محمد حمید اللہ)

جہاں بانی کے قواعد:۔

قرآن مجید میں اندرونی اور بیرونی سیاست کے قواعد خاصی تفصیل سے ملتے ہیں، جن سے حالت امن وصلح وغیر جانبداری میں حکمران کی رہنمائی مقصود تھی۔ رسول کریم صلعم نے خود ایک مملکت قائم کی اور اِس ملک میں جہاں ہمیشہ سے نراج سا چلا آرہا تھا، ایک مرکزیت اور ایک تنظیم پیدا کی اور عربوں کو خانہ جنگیوں کے ذریعے سے اپنی توانائیوں کو ضائع کرنے سے روک کر انہیں اپنے زمانے میں دنیا کی سب سے بڑی فاتح اور نو آباد کار قوم بنا دیا، اور ان کے ذہنوں سے احساس کمتری کو کلّی طور پر دور کر کے اُن میں وہ صحت اور جذبہ بھر دیا جسے احساس برتری یا احساس خود شناسی کہا جا سکتا ہے، اور جو کسی ترقی پذیر قوم کے لئے اس قدر ضروری ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک ولولہ دلانے والی چیز کو وہ اپنا مشن اور مقصد حیات باور کرنے لگے:۔

(ا) کُنتم خیر اُمة اُخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر ہ

''تم وہ بہترین قوم ہو جو انسانوں کے لئے پیدا کی گئی کہ تم اچھی بات کا حکم دیتے ہو اور بُری بات سے روکتے ہو۔ (قرآن مجید 3/85,3/19,3/110)

(ب) اُذن للذین یُقاتلُون بانهُم ظُلمُوا و نهوا عن المُنکر ط

''ان لوگوں کو جن سے لڑا جا رہا تھا (برابر کا جواب دینے کی) اجازت دے دی گئی کیونکہ ان پر ظلم کیا گیا تھا،۔۔۔۔۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار عطا کریں، تو وہ خدا کی عبادت کو قائم کر دیں، اور زکوٰۃ دیں، اچھی بات کا حکم دیں اور بُری بات سے روک دیں۔ (قرآن مجید 22/39,41)

(ج) قاتلُو هُم حتیٰ لا تکُون فتنةٌ و یکُون الدینُ کُلُه لله،

''ان سے اس وقت تک لڑتے رہو، تا آنکہ فتنہ باقی نہ رہے، اور خدا ہی کا دین چھا جائے۔

قرآن مجید (8/39)

(د) وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیراً و نذیراً ۔ (الایۃ)

(اے محمد ﷺ) ہم نے تجھے صرف اس لئے بھیجا ہے کہ تمام لوگوں کے لئے بشیر و نذیر بنے، گو اکثر لوگ اُسے نہیں جانتے (قرآن مجید 43/28)

(ہ) وما ارسلنک الا رحمۃً للعلمین ۔ (الایۃ)

"ہم نے تجھے نہیں بھیجا ہے (اے محمد ﷺ) مگر ساری دنیاؤں کے لئے رحمت کے طور پر"

(قرآن مجید 21/107)

غالباً یہی وہ ایقان یا احساس فرض تھا، جس نے انہیں دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی غرض سے اپنی ہر چیز کو قربان کر دینے کیلئے آمادہ کر دیا۔ جہاد کا جو حکم مذکورہ بالا اور دیگر آیاتِ قرآنی میں ملتا ہے، اس کا منشا یہ بالکل نہ تھا کہ دوسروں کی جائیداد لوٹی جائے، بلکہ اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ ایک مقدس ترین اور بڑا ایثار طلب فریضہ تھا کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر دوسروں کی رہنمائی کریں، اور اُن کو سیدھا راستہ دکھائیں۔ یہ بار جو خدا کی راہ میں تھا اُسے انہوں نے ہنسی خوشی برداشت کیا۔

قانون میں الممالک کے خاصے تفصیلی احکام ہمیں قرآن مجید میں ملتے ہیں جن پر مختلف مقالے بھی لکھے جاتے رہے ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں، صرف اس قدر اشارہ کافی ہے کہ قرآن مجید میں انتقامی جنگ (2/190,195) معاہدات کی تعمیل (9/7)، مدافعت (4/75)، (22/39,41)، ہمدردانہ جنگ (8/72)، فریق ثانی کی طرف سے معاہدہ شکنی کا خوف (8/58)، مذہبی رواداری (2/256، 109/6، 10/100)، غیر مسلم رعایا سے برتاؤ (9/29)، قیدیوں سے برتاؤ (47/4، 8/76، 9)، پناہ جویوں کو امن دینا (9/6) مفتوحہ اراضی کا انتظام (7/10)، صلح کرنا (8/61)، غیر جانبداری (4/88,91، 59/11,12، 60/8,9) وغیرہ وغیرہ امور کا اصولی ذکر ملتا ہے۔

قومی دولت:۔

كَیْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ۔

''تا کہ وہ تم میں سے صرف مالداروں میں گردش نہ کرتی رہے۔'' (قرآن مجید 59/7)

دولت عامہ کے متعلق یہ اسلامی اصول کا خلاصہ ہے جو قرآن مجید نے پیش کیا ہے۔اسلامی معاشیات کے پیش نظر یہ چیز رہی ہے کہ دولت کی ملک کے ہر طبقے میں تقسیم عمل میں آئے،اور وہ یکجا اکٹھی نہ ہو بلکہ گردش کرتی رہے۔معیار سے زائد دولت پر لازمی محصول (یعنی زکات) وصیت کرنے کے اختیارات کی تحدید اور کسی شخص کی جائداد سے اس کی وفات پر اس کے قریبی رشتہ داروں کو لازمی طور سے حصہ ملنا، نیز غرباء اور محتاجوں کے لئے حکومت کی آمدنی میں لازمی طور سے حصہ مقرر کیا جانا، یہ اور اس کے مماثل قاعدے قرآن مجید نے مقرر کئے ہیں، جن سے تقسیم و گردش دولت کا مقصد پورا ہوتا ہے۔اور ساتھ ہی انفرادی ملکیت پر کوئی قید عاید نہ ہونے سے ہر شخص کو اپنے قوائے فطری سے زیادہ سے زیادہ کام لینے کی ترغیب ہوتی رہتی ہے۔اور سود کی ممانعت اور قرضہ ہائے حسنہ کا انتظام جو قرآن مجید نے کیا ہے، وہ اسلامی قواعد معاشیات کو ایک مکمل نظام کی حیثیت دے دیتے ہیں، جو نہ تو سرمایہ داری ہے اور نہ اشتراکیت، بلکہ اس میں ان دونوں کی خوبیاں ہیں،اور ساتھ ہی دونوں کی برائیوں سے اس نظام کو محفوظ رکھنے کا انتظام کر دیا گیا ہے۔

اخلاق عامہ

جیسا کہ اوپر واضح کیا گیا، میرے نزدیک مذہب اور سیاست دونوں ایک دوسرے سے ممتاز عمل ہیں،ان کو ایک سمجھنا غلطی ہے۔مذہب انسان اور خالق کے تعلق کا نام ہے،اور سیاست بندوں کے باہمی تعلقات کیلئے برسر کار ہوتی ہے،لیکن اگر دونوں میں کوئی رابطہ اور حلقہ اتصال نہ پیدا کیا جائے،تو انسانیت کو لامحدود نقصان پہنچ جاتا ہے۔اسلام نے اس کا ایک حل تلاش کر لیا،اور اس کو کامیابی سے عمل میں لا کر بھی دکھا دیا۔اور وہ یہ تھا کہ اگرچہ مذہب اور سیاست دونوں کے دائرہ ہائے عمل بالکل جدا جدا ہیں،لیکن دونوں کے قواعد کا ماخذ و اساس ایک ہی چیز کو قرار

دیا گیا۔ چنانچہ مسلمانوں کا مذہب اور مسلمانوں کی سیاست دونوں کی رہنمائی قرآن و حدیث اصول انصاف و استحسان، اور ہم آہنگی ضمیر سے ہوتی ہے۔ آخر الذکر کے سلسلے میں ایک مشہور اسلامی اصول ہے کہ

استفت قلبك و لو افتاك المفتون۔ (افتاك الناس)

یعنی مفتیوں کا فتویٰ بھی مل جائے تو عمل سے پہلے دل (ضمیر) سے پوچھ لو اسے حدیث بھی سمجھا جاتا ہے۔

سیاسی اصطلاحات

اسلامی ادارہ ہائے سیاست نے اپنی بہت سی اصطلاحیں قرآن مجید ہی سے لی ہیں، چنانچہ اُمت اور ملت سے سیاسی جماعت مراد ہوتی ہے۔ خلیفہ اور امام اس جماعت کے سردار کا نام ہوتا ہے، (دیکھئے قرآن مجید 42/8) نیز سیرت ابن ہشام ص 341 میں رسول کریم ﷺ نے شہر مدینہ کے لئے ہجرت کے بعد جو دستورِ مملکت نافذ فرمایا تھا، اور جس کا پورا متن خوش قسمتی سے ہم تک پہنچ چکا ہے، اسکی دفعہ (2) میں بھی انہی اصطلاحات کو استعمال کیا گیا ہے۔

(لفظ خلیفہ کے لئے دیکھئے قرآن مجید 38/27 اور لفظ امام کے لئے 2/124)

جانشینی

لفظ خلیفہ کے ساتھ ہم جانشینی کے خارادار مسئلے سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ یہی وہ مسئلہ ہے جس نے تیرہ سو سال سے مسلمانوں کو دو بڑی متخاصم جماعتوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جو اسلام رسول کریم ﷺ اپنی امت کے لئے لائے تھے، اور جس کی آپ عمر تبلیغ کرتے رہے، اس کے بنیادی اصولوں میں کہیں بھی اس کا ذکر نہیں ہے کہ آپ کی جانشینی کے لئے کیا اصول ہو، اور اس اصول کا ماننا اس سے بھی کم ایک جز عقیدہ امر بن سکتا ہے، لیکن بدقسمتی سے اس کے بالکل برعکس صورت حال پیدا ہو گئی، اور ہر دو فریقوں کے ہاں غلو رکھنے والے خیالات بھی پھیلتے رہے۔ حالیہ زمانے میں ایک حل جو اس کے لئے سوچا گیا ہے، وہ سنجیدہ غور کا مستحق ہے، وہ یہ کہ سُنی اور شیعہ دونوں اس امر پر متفق ہیں کہ تاریخی واقعے کی حیثیت سے جناب رسالت مآب ﷺ کے بعد حضرت علیؓ پہلے

خلیفہ نہیں ہوئے۔ اسی طرح شیعہ اور سنی دونوں ہی اس پر متفق ہیں کہ روحانی امور میں حضرت علیؓ جناب رسالت مآب ﷺ کے خلیفہ بلافصل (خلیفہ بلافصل کے معنی گویا یہ ہوئے کہ جن نے براہ راست مشکوۃ نبوت سے فیض پایا اس معنی کے لحاظ سے تمام اکابر صحابہ خلفائے بلافصل تھے) ہیں چنانچہ چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ وغیرہ اور خود نقشبندیوں کی ایک شاخ غرض قریب قریب تمام ہی صوفی سلسلے اسی کو مانتے ہیں۔ (اور یوں بھی عالم مادی "روشنایان درا قلیمے دہ گنجند" صحیح ہو تو عالم روحانی میں ایک سے زیادہ خلیفہ بلافصل ہونے میں کوئی امر مانع نہیں) اب رہا یہ امر کہ حضرت علیؓ کو سیاسی جانشینی کا بھی استحقاق تھا یا نہیں، یہ ایک خاص علمی مسئلہ رہ جاتا ہے جس کو آنے والی روز مرہ سیاسی زندگی پر اب تیرہ سو سال بعد اثر انداز کرنے کی کوئی ضرورت نہیں رہتی۔

جس طرح ایک نبی کے بعد دوسرے نبی کے آنے تک اول الذکر ہی کی شریعت باقی رہتی ہے۔ اسی پر قیاس کر کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک حکمران کی وفات کے باوجود اس کے جانشین کے انتخاب تک اول الذکر ہی کا اقتدار جاری رہتا ہے، اور اسی کے مقرر کردہ افسر فرائض منصبی انجام دیتے رہنے کے پابند ہیں، چنانچہ:۔

کان ابو حنیفة یقول اذا مات الخلیفة فالقاضی علیٰ قضائه والوالی علیٰ ولایة حتیٰ یغیر له القائم بعده۔

(مناقب ابی حنیفہ للموفق ج صفحہ 88/87)

امام ابو حنیفہ فرماتے تھے، اگر خلیفے کا انتقال ہو جائے تو قاضی اپنی قضات پر اور والی اپنی حکومت پر باقی رہتا ہے جب تک خلیفے کا جانشین اسے بدل نہ دے۔

خاتمہ کلام

ظاہر ہے کہ دشمن کے اعتراف سے بڑھ کر بہتر طرفدارانہ اور وقیع شہادت کوئی اور ہو نہیں سکتی، اس لئے مذکورہ بالا اصول و نظریات پر عمل کے متعلق ہم اجنبیوں کے بیانات نقل کرتے ہیں۔

خلافت راشدہ کے آغاز پر مسلمانوں کے ہاتھوں حکومت الٰہیہ کی جس فتح کا آغاز ہوا اس کا وطن ہوئے عیسائیوں کی پیدائشی سلطنت تھی۔ اس جنگی کارروائی کو شروع ہو کر چھ سو سال بھی

نہیں گزرے تھے کہ (حضرت عمرؓ کے آخری زمانے یا حضرت عثمانؓ کے ابتدائی زمانے میں) ایک نسطوری پادری نے جو تاثرات سپرد کئے تھے وہ اتفاق سے محفوظ ہیں:۔

"یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے، وہ ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں۔ لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرِ پیکار نہیں بلکہ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے پادریوں اور مقدس لوگوں کا احترام کرتے ہیں۔ اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں"۔

اسی طرح کی ایک اور شہادت زمانہ حال کے ایک متعصب رومن کیتھلک پادری نے "کلیسائی تاریخ و جغرافیہ کے قاموس" میں یوں دی ہے:

"مسلمان عربوں کو یعقوبی (جاکوبائٹ) عیسائیوں نے بھی اپنے نجات دہندوں کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خودمختار وحدت قرار دیا جائے، اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے جائیں"۔

یہ تو نورِ نبوت سے براہِ راست منور ہونے والے عہد خلافت راشدہ کا ذکر تھا۔ اس کے صدیوں بعد کے دنیادارانہ دور کے متعلق روسی مستشرق پروفیسر بارتولڈ لکھتا ہے:۔

"حروب صلیبیہ کے زمانے میں، ایک روسی مورخ کلیسا کے مطابق پادری اور عوام سب ہی کی یہ خواہش تھی کہ مسلمانوں کا جوا ان کے کاندھوں پر واپس آجائے بہ نسبت اس کے کہ لاطینیوں کا تسلط برقرار رہے"۔

اسی طرح یونانی ادبیات کا مشہور مورخ کروم باخر تسلیم کرتا ہے:۔

"قسطنطنیہ کے سقوط کے عین ماقبل زمانے میں بیزنطینیوں کو لاطینی اہل مغرب سے کچھ اتنی شدید نفرت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اسلام سے نفرت پر غالب آگئی تھی۔ اور بہ کثرت تالیفوں میں نہ صرف یہ سوال اٹھایا جانے لگا کہ "کیا مسلمانوں کے ہاتھوں میں پڑنا لاطینیوں کے ہاتھوں میں پڑنے سے بہتر نہ ہوگا؟ بلکہ اس سوال کا اثبات میں جواب دیا جاتا رہا"۔

Scanned with CamScanner

ایک اور مؤلف کے دلچسپ مشاہدے پر اس ذکر کو ختم کیا جاتا ہے۔ پروفیسر واکر نے قانون بین الممالک کی تاریخ لکھتے ہوئے یہ ملاحظہ پیش کیا ہے کہ متمدن اور مہذب سلطنتوں پر وحشیوں کا دھاوا بول دینا اور غالب آ کر سلطنت وحکومت کے مالک بن جانا:۔

''مُعاشرہ انسان کی تاریخ ایک عادتی واقعہ ہے لیکن جرمنوں، تاتاریوں وغیرہ وحشیوں کے برخلاف عجیب بات یہ ہے کہ عرب کے بدو جب یک بیک اپنے صحرائی براعظم سے بیرون میں امنڈنے لگے (یعنی خلافت راشدہ میں) تو ان عربی فتوحات کو عام تصور کے وحشی فتوحات میں کسی طرح شامل نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ ان ''وحشی بدوؤں'' میں پہلے ہی دن سے ان کے مفتوحوں سے بھی بڑھ کر تہذیب اور اخلاقِ حسنہ نظر آتے ہیں۔

ہم اصُول بھی دیکھ چکے اور اس کا اطلاق بھی لیکن یہ محض سرسری خاکہ ہے جو نقش اولین سے بڑھ کر نہیں۔ ضرورت ہے کہ زیادہ قابل اہل علم اس موضوع پر توجہ فرمائیں۔

قرآن حکیم کی روشنی میں سائنس کا بیان

ترجمہ: ''ہم نے آسمان وزمین اوران کے درمیان کی چیزوں کو کھیلتے ہوئے نہیں بنایا۔ اگر ہم یونہی کھیل تماشے کا ارادہ کرتے تو اسے اپنے طور پر ہی اختیار کر لیتے اگر ہم (ایسا) کرنے والے ہی ہوتے۔ بلکہ ہم سچ کو جھوٹ پر پھینک مارتے ہیں۔ تو سچ جھوٹ کا سر توڑ دیتا ہے اور وہ (جھوٹ) اسی وقت نابود ہو جاتا ہے۔ (تو اے باطل پرستو!) تم جو باتیں بناتے ہو وہ تمہارے لئے باعث خرابی ہیں۔'' (سورۃ الانبیاء آیات 16/18)

اوپر کی سطور میں سورۃ الانبیاء کی تین آیات کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا۔ ان تینوں آیات میں اللہ تعالیٰ کا پیغام بہت واضح اور غیر مبہم ہے۔ یعنی یہ کہ کائنات اور تمام نظام کائنات کو کسی کھیل کی پیداوار سمجھنا ایک بھاری غلطی ہے۔ اور یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو کھیل تماشا اختیار کرنے کے لئے کچھ اور کر لیتا یہ عظیم و منظم کائنات تخلیق نہ کرتا۔ پھر یہ اصول بھی بیان کر دیا گیا ہے کہ سچائی ہی کی فتح ہوگی اور جھوٹ کو شکست نصیب ہوگی۔ جھوٹ اور سچ کی کشمکش کے ضمن میں انداز بیان سے واضح ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر دور اور ہر عہد میں ایسا ہی کرتا ہے۔ سب سے آخر میں جھوٹ کی حمایت کرنے والوں اور اس پر دلیلیں پیش کرنے والوں کو بھی تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کی باتیں خود اُن کے لئے خرابی کا باعث ہیں۔

آیئے، اب ہم ان آیات کے مندرجات پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے آج جتنی ترقی کر لی ہے اور روزمرہ زندگی میں جو اہم و نمایاں مقام حاصل کر لیا ہے وہ معلومہ تاریخ میں کبھی اتنا زیادہ نہیں رہا۔ سائنس کی یہ ترقی آنے والے وقت میں کس رُخ پر جائے گی؟ اس بارے میں حتمی طور پر کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ تاہم موجودہ دور میں سائنسی وفنیاتی پیش رفت کی بدولت تمام الہامی مذاہب کو بالعموم اور اسلام کو بالخصوص کئی طرح کے اعتراضات کا سامنا ہے۔

اسے ہم انسانوں کی ذہنی کج روی ہی کہا جا سکتا ہے کہ آج سائنسی ماہرین کا ایک طبقہ یہ اصرار کر رہا ہے کہ کائنات، لامتناہی امکانات میں سے ایک امکان ہے جس میں ''اتفاق'' سے وہ ساری کی ساری شرائط پوری ہو گئی ہیں جو کائنات کے کسی گوشے میں ذہین حیات (یعنی انسان) کے پروان چڑھنے کے لئے ضروری ہیں۔ یعنی کائنات کی تخلیق اور اس کے پیچیدہ منظم نظام میں کوئی منصوبہ کوئی اعلیٰ وارفع سوچ اور کوئی عظیم ترین فکر کارفرما نہیں ہے۔ بہ الفاظ دیگر ایسے سائنسی

''ماہرین'' اس کائنات کے کسی خالق مطلق کے وجود سے انکار کو ''سائنس'' قرار دیتے ہیں۔

خدا کے وجود سے انکار کے باوجود سائنس دانوں کا یہ طریقہ بھی کائنات کے ہر پہلو میں نظم و ضبط اور خوبصورتی کی موجودگی کا قائل ہے۔ وہ خالق کا تصور درمیان میں لائے بغیر ہی یہ بتاتے ہیں کہ اگر چہ کائنات کی ابتدا، نہایت متوازن اور ہموار انداز میں ہوئی لیکن توانائی کے اس انتہائی کثیف سمندر میں انتہائی معمولی درجے کی ناہمواریاں بھی تھیں۔ انہی ناہمواریوں کی بدولت کائنات میں کہکشائیں، ستارے، سیارے اور دوسرے چھوٹے بڑے اجسام وجود میں آئے۔ کائنات اس شکل میں آئی کہ جیسا ہم اسے دیکھتے ہیں۔ اگر عین ابتدائے کائنات میں یہ ناہمواریاں موجود نہ ہوتیں تو ہر چیز پورے توازن کے ساتھ، ہر سمت میں یکساں شرح کے ساتھ پھیلتی چلی جاتی۔ ایٹموں کو آپس میں یکجا ہو کر گیسی گولے بنانے کا موقع نہ ملتا، نہ گیس کے عظیم بادل وجود میں آتے، نہ ان بادلوں میں ستارے پروان چڑھتے، نہ قریبی ستاروں کو مزید قریب آکر کہکشائیں تشکیل دینے کا موقع ملتا، کوئی کہکشانی جھرمٹ بھی کبھی نہیں بنتا اور نہ کوئی ایسا سیارہ ہی وجود میں آتا جس پر زندگی پروان چڑھ سکتی۔

اس وقت، کائنات کا اوسط درجہ حرارت صرف 3.5 درجے کیلون (منفی 269.65 ڈگری سینٹی گریڈ) ہے۔ اب تک جو کچھ بھی ہم نے کہا، اسے دوسرے الفاظ میں یوں بھی بیان کیا جاسکتا ہے کہ اگر ابتدائے کائنات میں وہ (سوچی سمجھی) ناہمواریاں نہ ہوتیں تو آج بلاشبہ کائنات کا اوسط درجہ حرارت 3.5 درجے کیلون ہی ہوتا لیکن اس تاریک اور سرد سمندر میں زبردست توانائی کے ایسے جزیرے (ستارے) نہیں ہوتے جن کے گرد کبھی نظام شمسی جیسی کوئی چیز وجود میں آتی۔ ہم اپنے قارئین کو یاد دلاتے چلیں کہ ابتدائے کائنات کی ناہمواریاں انتہائی معمولی تھیں۔

سائنس دانوں کا یہی طبقہ خالق کو درمیان میں لائے بغیر اس بات کا اعتراف بھی کرتا ہے کہ کائنات کی چاروں بنیادی قوتوں میں ایک عجیب و غریب توازن اور ہم آہنگی ہے جس کی وضاحت کرنا بے حد مشکل ہے۔ وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اگر کائنات کی چار بنیادی قوتوں (یعنی مضبوط نیوکلیائی قوت، کمزور نیوکلیائی قوت، برقی مقناطیسی قوت اور قوت ثقل) میں یہ توازن اور ہم آہنگی موجود نہ ہوتی تب بھی اس کائنات کا موجودہ حالت تک آجانا قطعاً ناممکن تھا۔ یہ اس قدر

نازک توازن ہے کسی ایک قوت کے لئے بھی اپنی حالیہ شدت سے ایک کے دس ہزار کھربویں حصے کے انحراف کی گنجائش بھی نہیں ۔ افراطی کائنات (InflationaryUniverse) نامی نظریئے کے خالق، ایلین گتھ کے الفاظ میں ''کائنات کو ایک ایسی باریک نوک والی پنسل کی مانند بھی تصور کیا جاسکتا ہے جو پچھلے پندرہ ارب سال سے اپنی نوک کے سہارے پر ٹکی ہوئی ہے۔''

(جناب ہارون یحییٰ کی کتاب The Creation of the Universe میں کائنات کے توازن پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے جس کا ترجمہ ادارہ گلوبل سائنس نے ''کائنات کی تخلیق'' کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے قارئین مذکورہ کتاب کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔)

قصہ مختصر یہ کہ ابتک جتنی بھی سنجیدہ سائنسی تحقیق ہوئی ہے، اس سے یہی پتہ چلتا ہے کہ کائنات کے ہر ایک پہلو میں مکمل نظم ہے۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے تمام سائنس داں متفقہ طور پر تسلیم کرتے ہیں، چاہے وہ خدا کو مانتے ہوں یا نہ ہوں۔ اصل اختلاف وہاں سے شروع ہوتا ہے جب ہمارے سامنے ''یہ سب کس نے کیا؟'' کا سوال آتا ہے۔

ملحد (یعنی خدا کے وجود سے انکار کرنے والے) طبقے کا کہنا ہے کہ یہ سب کچھ ''بس یونہی'' ہو گیا۔ ان کے مقابلے پر خدا پرستوں کا طبقہ (جسے تخلیق پرست بھی کہا جاتا ہے) اس بات کا قائل ہے کہ یہ سب کچھ ایک خالق کے دست قدرت سے وجود میں آیا ہے۔ اس وقت ہمیں بڑی عجیب و غریب کیفیت کا سامنا ہوتا ہے جب کوئی الحاد پرست ماہر کسی فطری مظہر (natural phenomenon) کی عقلی وضاحت پیش کرتا ہے یا اس بارے میں کوئی سائنسی نظریہ تشکیل دیتا ہے اور یہ کہتا ہے'' دیکھئے اب ہم نے اس مظہر کی عقلی اور سائنسی توجیح تلاش کر لی ہے لہٰذا ہمیں اس کے لئے کسی خدا کی ضرورت نہیں (معاذ اللہ)۔''

سائنس کے ایک طالب علم کی حیثیت سے آج تک ہماری سمجھ میں یہ نہیں آسکا کہ آخر یہ سب کہنے اور خدا کے وجود پر طعنہ زنی کرنے سے سائنسی ترقی کا کونسا مقصد حاصل ہوتا ہے؟ رہا سوال کسی فطری مظہر کی سائنسی اور عقلی توجیح کا، تو اس ضمن میں دو نکات کا ذہن نشین رہنا ضروری ہے اول یہ کہ سائنس کا مقصد کسی نظام کے کام کرنے یا رد یہ عمل ہونے کے طریقہ کار پر اس کے

معلومہ جزئیات کی روشنی میں بحث کرنے اور اس نظام کی وضاحت کرنے کا نام ہے۔ یعنی سائنس ہمیں کسی نظام کی ساخت اور تنظیم کے بارے میں تو بتا سکتی ہے لیکن یہ ہرگز نہیں بتا سکتی کہ اس کا خالق کون ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ سائنس میں کسی بھی قانون یا نظریئے کو حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لہٰذا کوئی بھی سائنسی نظریہ خواہ وہ کتنا ہی تازہ اور جدید ترین کیوں نہ ہو، متعلقہ فطری مظہر کی حتمی توضیح نہیں ہوتا بلکہ اسے سابقہ توضیحات کے سلسلے میں ایک ''پیش رفت'' قرار دیا جاتا ہے۔ لہٰذا سائنس ہی کی روشنی میں (کسی مذہبی بحث کو درمیان میں لائے بغیر) الحاد پرستی خود ہی ایک احمقانہ تصور ثابت ہو جاتی ہے۔ اگر ملحدین کا یہ کہنا درست مان لیا جائے کہ سائنس کے پاس خدا کے عدم وجود کی بھی کوئی دلیل یا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

تاہم جب کائنات کے حد درجہ منظم ہونے کی حقیقت کو سامنے رکھا جائے تو بے اختیار ایک سوال کا سامنا ہوتا ہے جو سائنس سے باہر ہے۔ یعنی یہ کائنات یقیناً کسی خالق نے سوچ سمجھے منصوبے کے تحت ہی پیدا کی ہے، ورنہ اس میں یہ تنظیم و ترتیب ہرگز موجود نہیں ہوتی۔ سورۃ الانبیاء کی مذکورہ تینوں آیات میں اللہ تعالیٰ ہمیں یہی پیغام دے رہا ہے کہ اس نے یہ کائنات ہنسی کھیل کے لئے پیدا نہیں کی ہے۔

اگر ہم اس نظام کائنات پر غور و فکر کے بعد اللہ تعالیٰ کو خالق و مالک تسلیم کر لیں تو اسی میں ہماری بھلائی ورنہ باطل پرستی کی رو میں بہہ کر خدا کے وجود سے انکار کا اللہ تعالیٰ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا بلکہ ہمارا یہ عمل ہمارے اپنے لئے ہی خرابی کا باعث ہے۔ آخر میں ایک بات اور یاد رکھئے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کوئی بھی رائے ہم پر مسلط نہیں کرتا بلکہ آزادانہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہوئے ہمیں صحیح راستہ دکھاتا ہے اور اس پر چلنے کی دعوت دیتا ہے۔ اب اگر ہم اس راہ کو دیکھنے ہی سے انکار کر دیں یا اس پر نہ چلیں تو یہ ہمارا اپنا اختیار ہے جس کے لئے ہمیں خود جواب دہ ہونا پڑے گا۔ (بشکریہ از گلوبل سائنس)

افکار اشفاق

یااللہ مجھے سکونِ قلب عطاکر
جو ہو قبول وہ دعامانگنے کاسلیقہ عطاکر
میں صراط مستقیم پر ہمیشہ چل سکوں
وہ سمجھ بوجھ وہ دانش وہ عقل عطاکر
اس دنیا کو اِک دن خداحافظ تو کہناہی ہے
حد درجہ کروں نیکیاں ایسی سعادت عطاکر
میں تو اِک ادنیٰ سا انسان ہوں
آ سکوں کام مخلوقِ خدا کے وہ جذبہ عطا کر
جو ہوں بھوکے اُنکے لئے مہیا کر سکوں کھانا
جو چلتا رہے ہمیشہ ایسا لنگر عطا کر
بیماروں کے لئے کھول سکوں دل کے دروازے
یااللہ میرے ہاتھ میں ایسی شفا عطا کر
متلاشیوں کے لئے بھی کر سکوں اک شمع روشن
ایسا حسنِ ظن ایسی چشمِ بینا عطا کر
یتیموں، مسکینوں، بیواؤں اور مجبوروں
کر سکوں ان سب کی داد رسی ایسا حوصلہ عطا کر
میری اپنی زندگی میں ہزار ہا کوتاہیاں ہوئیں
بہا سکوں اُن پر ندامت کے آنسو وہ آنسو عطا کر
فانی زندگی میں بانٹ سکوں کچھ خوشیاں
فہم و فراست کی اِک ایسی مشعلِ راہ عطا کر
اشفاق کے دِل میں اِک خاص تڑپ ہے
تیرے قریب آ سکوں ایسا قُربِ عظیم عطا کر

التجا

آؤ اس دنیا کو حسین بنائیں
کریں عبادت اور بارونق جبیں بنائیں
آسماں تو ویسے ہی بلند و بالا ہے
جو ہمارے پاس ہے زمین آؤ اسکو سجائیں

امیر تو دنیا میں بہت ہیں
آؤ رَل مِل کر غریبوں کی قسمت جگائیں
جو تن سے ننگا ہو اُسے ڈھانپیں
اور جو بھوکا ہو اُسے کھانا کھلائیں
لوگ تو بازار کو رونق سمجھتے ہیں
آؤ اپنے آپ کو شرم و حیا کی چادر پہنائیں
مانا کہ گزرا وقت ہاتھ نہیں آتا
آؤ جو روٹھ رہا ہے وقت اُسے منائیں
سب مال و متاع ادھر ہی رہ جائے گا
آؤ اشفاق اس عارضی سفر کے لئے ایک خیمہ لگائیں

اہم اِطلاع

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا سالانہ اِجتماع اِنشاءاللہ

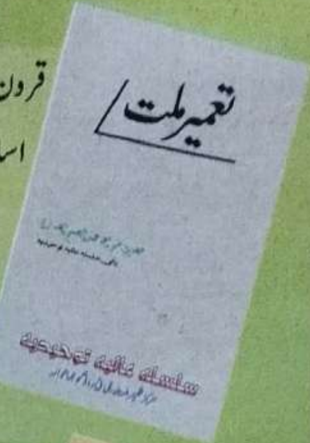
15,14 اور 16 اپریل 2006ء بروز جمعہ' ہفتہ' اتوار

منعقد ہو رہا ہے۔ اِس بار دعوت نامے ارسال نہیں کیے جائیں گے۔ پروگرام کی ترتیب وہی ہوگی جو گذشتہ سالوں سے چلی آ رہی ہے اِس لئے اِس اطلاع کو حتمی اور دعوت نامہ تصور کیا جائے۔

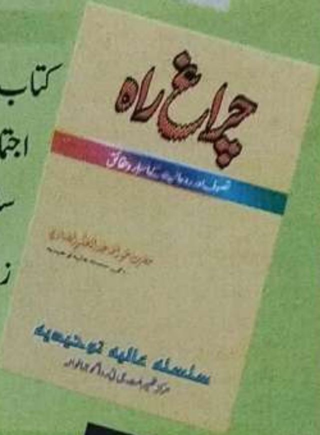
تمام برادران سے درخواست ہے کہ مجلّہ فنڈ برائے سال 2006ء مبلغ 200/ روپے مرکز تعمیر ملت ارسال کر دیں یا اپنے خادم حلقہ کے ذریعے ارسال کر دیں۔

(ادارہ)

بانی سلسلہ کی دیگر تصانیف



قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق وآداب کے اسرار ورموز اور نفسیاتی اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔



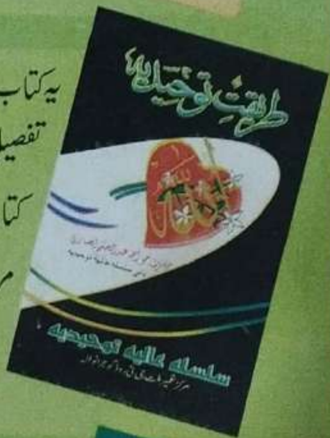
کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔

سلوک وتصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔

زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔

تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔



یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام اوراد و اذکار اور اعمال واشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔



کتاب ہذا وحدت الوجود کے موضوع پر ایک مختصر مگر نہایت مدلل اور اہم دستاویز ہے خواجہ صاحب نے ذاتی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان زبان میں بیان کیا

ابن عربیؒ کے نظریہ وحدت الوجود اور حضرت مجدد الف ثانیؒ کے وحدت شہود میں فرق۔

انسان کی بقا اور ترقی کیلئے مذہب کیوں ناگزیر ہے۔

وہ بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا۔

روحانی سلوک کے دوران تمام بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔